بلاک

۱

پیش لفظ

پہلا بلاک اردو زبان کی پہچان کے بارے میں ہے۔ اس میں چار اکائیاں ہیں ہر اکائی میں تقریباً پانچ ہزار لفظ ہیں اور کوئی ڈیڑھ ہزار الفاظ کی مشتقیں اور سوالات ہیں ان میں ہر اکائی زبان کے کسی نہ کسی اہم پہلو پر ہے۔

پہلی اکائی اردو زبان کی پہچان کے بارے میں ہے یعنی لکھاوٹ، الفاظ کے خزانے اور قواعد کے اعتبار سے اردو کی پہچان کیا ہے۔ آپ کو اس اکائی کو پڑھتے وقت اندازہ ہوگا کہ ہر لفظ کے سلسلے کتنی دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔

دوسری اکائی لفظوں کی بناوٹ کے بارے میں ہے۔ روزنئی ضرورتیں پیش آتی رہتی ہیں اور ہر نئی ضرورت نیا لفظ ساتھ لاتی ہے یہ نئے لفظ کبھی کبھی پرانے لفظوں کے آگے یا پیچھے کچھ بڑھا کر بھی بنا لیے جاتے ہیں اس اکائی میں انہیں سابقوں اور لاحقوں سے بننے والے لفظوں کا ذکر کیا گیا ہے آپ انہیں خود بھی بنا سکیں گے۔

تیسری اکائی لفظوں کے باہمی رشتوں کے بارے میں ہے۔ آپ نے

دیکھا ہوگا کہ بعض لفظ ایک دوسرے کے قریب اور ہم معنی ہوتے ہیں۔ بعض ایک دوسرے کے بالکل مخالف، جیسے رات اور دن، صبح اور شام، تیسری اکائی میں انہیں کا بیان ہے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ جس کے پاس الفاظ کا زیادہ سرمایہ ہوتا ہے اس کے پاس قوّت بھی زیادہ ہوتی ہے یہ الفاظ آپ کی قوّت بڑھائیں گے اور آپ میں زیادہ بھروسہ اور اعتماد پیدا کریں گے۔

چوتھی اکائی ہے اصنافِ ادب کی۔ زبان ادب میں برتی جاتی ہے اور ادب کی بہت سی قسمیں ہیں۔ نثر کی بھی اور نظم کی بھی۔ اس اکائی میں انہیں کی پہچان کرائی گئی ہے۔

اِس بلاک کی سبھی اکائیاں پڑھ لینے کے بعد آپ اردو زبان اور ادب کے بنیادی ڈھانچے سے واقف ہو جائیں گے اور ان کی پہچاننے ہی کے نہیں، اس کو بہتر طریقے پر برتنے کے قابل بھی ہو جائیں گے۔

ایک بات البتہ یاد رکھنے کی ہے:

یہ ساری اکائیاں آپ خود بغیر کسی استاد کی مدد کے پڑھ رہے ہیں، دوسرے معنوں میں یوں کہیے کہ آپ خود اپنے استاد ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ آپ استاد کی طرح اپنے کان کھینچیں مگر اتنا ضرور یاد دلا دیں کہ آپ کی ذمّہ داری طالب علم کی بھی ہے اور استاد کی بھی۔ جتنی مشقیں دی گئی ہیں وہ پوری محنت اور دیانت داری ہی سے نہیں پوری دلچسپی سے کر لیں تاکہ جو باتیں ان اکائیوں میں بتائی گئی ہیں وہ آپ کے ذہن نشین ہو جائیں، اپنا امتحان خود لیجیے، کی مشقیں کرنے کے بعد جوابات آخر میں دیکھ لیں۔

ہر اکائی کو دو حصّوں میں بانٹ دیا گیا ہے یہ اس لیے کیا گیا ہے کہ آپ دوسرے حصّے تک پہنچتے پہنچتے پہلا حصّہ بھول نہ جائیں۔ ان سبھی حصّوں میں ہی نہیں سبھی اکائیوں میں بھی باہمی ربط ہے اور یہ ایک دوسرے سے جُڑی ہوئی ہیں بار بار آپ کو پچھلی اکائیوں سے رجوع کرنا پڑے گا اس کا خاص طور پر خیال رکھیں کہ دراصل علم خود ہی ایک اکائی ہے۔

اکائی ۱: اردو کی پہچان

ترتیب

۱-۰ مقاصد
۱-۱ دیباچہ
۱-۲ زبان کیا ہے
۱-۲-۱ لکھاوٹ
۱-۲-۲ لفظوں کا خزانہ
۱-۲-۳ قواعد یا گرامر
اپنا امتحان خود لیجیے I
۱-۳ اردو زبان کیا ہے
۱-۳-۱ لکھاوٹ، رسم خط اور املا
مشق I
۱-۳-۲ لفظوں کا خزانہ
اپنا امتحان خود لیجیے II
۱-۳-۳ قواعد یا گرامر
۱-۴ اردو زبان کی ادبی روایت
مشق II
۱-۵ خلاصۂ بحث
جوابات
مزید مطالعے کے لیے

۱-۰ مقاصد

۱. اس اکائی کا مقصد
۲۔ اردو زبان کی پہچان کرانا
۳۔ اردو زبان کی خصوصیات کی طرف دھیان دلانا۔

تاکہ اردو لکھتے اور پڑھتے وقت آپ صحیح اردو کا معیار سامنے رکھ سکیں۔

یوں تو اردو زبان کی خاص باتیں بہت سی ہیں۔ یہاں صرف گرامر کے ڈھانچے، لفظوں کے ذخیرے اور لکھاوٹ کے طریقے یعنی رسم خط ہی کو بنیادی مانا گیا ہے اور انہیں سے بحث کی گئی ہے۔ اس اکائی کو ختم کرنے کے بعد آپ ان تینوں باتوں کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کر سکیں گے اور صحیح اردو لکھ سکیں گے یہی ہمارا مقصد ہے۔

۱۔۱۔ دیباچہ

چاہے آپ سائنس پڑھتے ہوں یا جغرافیہ، تاریخ پڑھتے ہوں یا اقتصادیات اور کامرس۔ ہر مضمون میں آپ کو بہت کچھ سیکھنا اور پڑھنا ہوتا ہے اور پھر جو کچھ آپ نے پڑھا اور سیکھا ہے اسے بیان کرنا ہوتا ہے۔ بیان کرنے یا بتانے کے لیے کسی نہ کسی زبان کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ یہ زبان مادری زبان سے بہتر نہیں ہو سکتی یا پھر کوئی ایسی زبان ہو جسے آپ نے خود اپنی دوسری زبان مان لیا ہو۔

اس لیے زبان سے مناسب حد تک واقف ہونا اور اسے جاننا اور ٹھیک ٹھیک برتنا ہر مضمون کے طالب علم کے لیے ضروری ہے بلکہ ہر انسان کے لیے ضروری ہے۔ جس زبان کو آپ جانتے اور بولتے ہیں اس کو پہچاننا اور اس کی خصوصیات کو جاننا ضروری ہے کیونکہ آپ جو کچھ بولتے ہیں اکثر اسی سے پہچانے جاتے ہیں۔ زبان خود آپ کی پہچان ہے۔

۱۔۲۔ زبان کیا ہے؟

اب آپ اس سبق کے لیے تیار ہیں۔ صبح کا وقت ہے دھوپ کھلی ہوئی ہے موسم نہ زیادہ گرم ہے نہ زیادہ ٹھنڈا۔ آپ نہا دھو کر ناشتہ کرنے کے بعد کرسی پر بیٹھے ہیں سامنے میز پر آپ نے کاغذ یا کاپی رکھی ہے، پنسل یا بال پن یا قلم اور روشنائی بھی موجود ہے، میز پر صاف ستھرا میز پوش بچھا ہے اور اس کے ایک کنارے گھڑی یا ٹائم پیس رکھی ہوئی ہے۔

آپ کا یہ گھر کسی نہ کسی محلے یا بستی میں ہے آپ اور ہم کسی نہ کسی بستی یا محلے میں رہتے ہیں اور محلے اور پڑوس والوں سے ملتے جلتے ہیں ایک کا کام دوسرے سے پڑتا ہے معمولی معمولی باتوں کے لیے بھی ہم ایک دوسرے کے محتاج ہوتے ہیں۔ آدمی آدمی کے کام آتا ہے اسی لیے سبھی اپنی اپنی ضرورتوں کے لیے دوسرے انسانوں سے بات کرنے اور ان کی بات سننے اور اپنی

بات کہنے کے لیے مجبور ہیں۔

بازار جائیے تو دکان دار کو بتانا پڑے گا کہ آپ کو کون سی چیز چاہیے گھر آئیے تو ماں باپ، بھائی بہن، بیوی بچے، شوہر سے بات کرنی پڑے گی۔ پانی مانگنا ہو یا کھانا کھانا ہو سبھی کے لیے انسان زبان کا محتاج ہے۔ اسی کے ذریعے آدمی اپنی بات دوسروں تک پہنچاتا ہے اور دوسروں کی بات سمجھتا ہے اس لحاظ سے زبان انسانوں کے درمیان رابطے کا لازمی ذریعہ ہے۔

۱-۲-۱ لکھاوٹ

رابطہ دو قسم کا ہوتا ہے یا تو جس آدمی سے آپ بات کر رہے ہیں وہ آپ کے سامنے ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں صرف باتیں کرنا کافی ہوتا ہے۔

مگر یہ بھی ہوتا ہے کہ جس سے آپ کو کچھ کہنا ہے وہ آپ کے سامنے نہیں ہے دور ہے شہر یا ملک کے باہر ہے اس صورت میں آپ خط لکھتے ہیں اور وہ باتیں جو آپ زبان سے کہتے قلم کے ذریعے لکھ کر اس تک پہنچاتے ہیں۔ یہ زبان کی تحریری شکل ہے اور اسی کے لیے لکھاوٹ کا سہارا لیا جاتا ہے۔

آپ کے گھر میں یا پڑوس میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، دو آدمیوں نے ایک دوسرے سے بات کی، ٹیلی ویژن پر خبریں سنانے والے نے خبریں سنائیں یا ناٹک پیش کرنے والے ایکٹر اور ایکٹریس نے آپس میں بات کی ان سب میں زبان کا استعمال تو ہوا مگر لکھاوٹ کی ضرورت نہیں پڑی۔

مگر لیجیے آپ کے دروازے کے نیچے سے کسی اخبار والے نے آج کا اخبار کھسکایا۔ وہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا، معلوم ہوا ڈاکیہ آپ کے دوستوں اور رشتے داروں کے خط لایا ہے۔ اخبار اور خط کے ذریعے جو باتیں ہوئیں وہ سب لکھاوٹ کے ذریعے ہوئیں اور اس کے لیے رسم خط کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ بھی طے کرنا ہوتا ہے کہ کسی زبان میں کسی لفظ کو لکھنے کا طریقہ کیا ہوگا اسے املا کہتے ہیں۔

۱-۲-۲ لفظوں کا خزانہ

اگر ایک جملے میں اردو زبان کی پہچان بیان کرنی ہو تو کہا جا سکتا

ہے کہ یہ قواعد کے حساب سے کھڑی بولی اور لکھاوٹ کے لحاظ سے ہندوستان کی آوازوں اور وسطا اور مغربی ایشیا کے رسم خط میں لکھی جانے والی زبان ہے جو آزادی سے ہندوستانی زبانوں کے علاوہ فارسی، عربی، ترکی، انگریزی، پرتگالی، سبھی زبانوں کے لفظوں کو لے لیتی ہے اور انہیں اپنے مزاج، اپنی آوازوں اور اپنے مطلب کے مطابق ڈھال لیتی ہے۔

جب مختلف زبان اور مختلف تہذیبوں والے لوگ آپس میں ملتے جلتے ہیں تو لفظوں کا بھی لین دین ہوتا ہے اور یہ لفظ ہر زبان اپنے مزاج کے مطابق اپنا لیتی ہے۔ اب ذرا اس عبارت کو پڑھیں جو اس اکائی کے شروع میں دی گئی ہے۔

"صبح کا وقت ہے۔ دھوپ کھلی ہوئی ہے۔ موسم نہ زیادہ گرم ہے نہ زیادہ ٹھنڈا۔ آپ نہا دھو کر ناشتہ کرنے کے بعد کرسی پر بیٹھے ہیں سامنے میز پر آپ نے کاغذ یا کاپی رکھی ہے پنسل یا بال پن یا قلم اور روشنائی بھی موجود ہے۔ میز پر صاف ستھرا میز پوش بچھا ہے اور اس کے ایک کنارے گھڑی یا ٹائم پیس رکھی ہوئی ہے۔"

جن لفظوں کے نیچے ایک لکیر کھینچی ہوئی ہے وہ عربی کے ہیں مگر قریب قریب سبھی کے بولنے کا انداز اور معنی مطلب سب کچھ بدل گئے ہیں: گرم ناشتہ، روشنائی، کنارے، یہ سب لفظ فارسی کے ہیں۔ میز، کرسی، پرتگالی لفظ ہیں۔ کاپی، پنسل، بال پین، ٹائم پیس انگریزی کے لفظ ہیں۔ میز پرتگالی سے لے کر اس پر پوش بڑھا کر فارسی طریقے کے مطابق "میز پوش" لفظ بنایا گیا ہے باقی لفظ ہندوستانی زبانوں کے ہیں۔

ان سب لفظوں میں آپ کو دو قسم کے لفظ ملیں گے۔ ایک ایسے جو دوسری زبانوں سے جوں کے توں لے لیے گئے ہیں اور ان میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں کی گئی ہے مثلاً پنسل انگریزی سے یا قلم عربی سے جوں کے توں لے لیے گئے ہیں۔

ایسے لفظوں کو تت سم کہتے ہیں۔

دوسرے ایسے لفظ ہیں جو دوسری زبانوں سے لیے تو گئے ہیں مگر ان میں تبدیلی کر لی گئی ہے اور بولنے والوں نے انہیں اپنے مزاج کے مطابق بدل لیا ہے کبھی ان کو بولنے کا طریقہ بدل دیا گیا ہے مثلاً موسیم کو موسم کر لیا اور اس کے معنی بھی بدل دیے۔ روشنائی فارسی میں روشنی کے معنی میں استعمال ہوتی ہے مگر اسے قلم سے لکھی جانے والی کالے یا نیلے یا لال یا ہرے رنگ کی چیز کو کہتے ہیں جس سے کاغذ پر لکھا یا چھاپا جاتا ہے۔

ایسے لفظوں کو جو تبدیلی کے بعد اختیار کیے جاتے ہیں تدبھو کہتے ہیں۔

اسی طرح زبانوں میں لفظوں کا لین دین برابر جاری رہتا ہے زندگی آگے بڑھتی ہے تو نت نئی چیزیں، نئی نئی ایجادیں سامنے آتی رہتی ہیں، نئے نئے کام ہوتے رہتے ہیں اور نت نئے کارنامے انجام پاتے رہتے ہیں ان کے ساتھ ساتھ نئے لفظ اور زبان کے نئے ذخیرے سامنے آتے رہتے ہیں اور زبان میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی ہیں۔

اس طرح ہر زبان کے پاس لفظوں کا ایک خاص ذخیرہ ہوتا ہے اس ذخیرے میں تین قسم کے لفظ ہوتے ہیں:

- وہ لفظ جو اس زبان کے بنیادی ڈھانچے سے تعلق رکھتے ہیں۔
- وہ لفظ جو اس نے دوسری زبانوں سے جوں کے توں لے لیے ہیں۔ ——— (تت سم) اور
- وہ لفظ جو اس نے دوسری زبانوں سے تھوڑا بہت بدل کر اختیار کر لیے ہیں ——— (تدبھو)

۱-۲-۳ قواعد یا گرامر

زبان کی تیسری پہچان ہوتی ہے ان کی قواعد یا گرامر۔

لفظ جب بولے یا لکھے جاتے ہیں تو اکثر ملا جلا کر بولے جاتے ہیں اور ان سے مطلب اسی وقت نکلتا ہے جب الگ الگ لفظ مل کر جملہ بن جائیں یا کسی ایک بات کو واقعے یا بیان کو ادا کر سکیں یہی قواعد یا گرامر ہے۔ ہر زبان کی گرامر یا قواعد کا ڈھانچہ دوسری زبانوں سے الگ ہوتا ہے اسی لیے ایسی زبانیں بھی جو ایک ہی سے لفظ استعمال کرتی ہیں اپنی قواعد یا گرامر

کے ڈھانچے کی وجہ سے الگ الگ پہچانی جاتی ہیں۔ مثلاً انگریزی کے ایک ہی قسم کے لفظ اگر مراٹھی اور بنگلہ زبانوں کے کسی ایک جملے میں برتے جائیں تو بھی وہ الگ الگ زبانوں ہی کے جملے سمجھے جائیں گے کیوں کہ مراٹھی اور بنگلہ کے جملوں کی بناوٹ الگ الگ ہے۔ اس بناوٹ کو دو حصّوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ایک ایسے لفظ جو کسی چیز کا نام ہیں (اسم) دوسرے وہ جو کسی کام کے کرنے یا ہونے کو بیان کرتے ہیں (فعل)

اپنا امتحان خود لیجیے I

نیچے ایک چارٹ دیا جا رہا ہے، خالی جگہوں کو مناسب معلومات سے پُر کیجیے۔ اپنے جوابات کا آخر میں دیے ہوئے چارٹ سے مقابلہ کریں:

	بنیادی شکلیں		بنیادی ←		عناصر ←				
			بکھاوٹ		الفاظ			قواعد	
زبان	۱	۲	۱	۲	۱	۲	۳	۱	۲
	بول چال	تحریری	رسم خط	اِملا	بنیادی	تت سم	تدبھو	اسم	فعل

اس صفحے تک پہنچتے پہنچتے آپ ضرور تھک گئے ہوں گے اگر ابھی تک آپ پوری توجہ سے ہماری بات کو سمجھتے رہے ہیں تو آپ کو تھوڑی دیر کا وقفہ ضرور چاہیے آرام کر لیجیے اور اگر آپ چائے یا کافی پسند کرتے ہیں تو ایک پیالی چائے یا کافی پی لیجیے۔

اور جب آپ کافی یا چائے پی رہے ہوں تو ذرا اپنی یادداشت کو بھی تازہ کرتے رہیں۔

زبان انسانوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ ہے۔

اس رابطے کی دو شکلیں ہوتی ہیں: زبانی بات چیت یا تحریری شکل

تحریری شکل لکھاوٹ کہلاتی ہے اور ہر لکھاوٹ کے لیے رسم خط ضروری ہے اور ہر لفظ کے لکھے جانے کا طریقہ یعنی املا طے ہونا لازمی ہے یعنی کس لفظ کو کس طرح لکھا جائے گا اس کے اصول طے ہوتے ہیں۔

ہر زبان کا اپنا ذخیرۂ الفاظ ہوتا ہے اور اس ذخیرے میں تین قسم کے لفظ ہوتے ہیں:

کسی زبان کا بنیادی ذخیرہ
دوسری زبانوں سے جوں کے توں
لیے ہوئے لفظ (تت سم)
دوسری زبانوں سے تبدیلی کے
ساتھ لیے ہوئے لفظ (تدبھو)

ہر زبان کے قواعد کا خاص ڈھانچہ ہوتا ہے اور قواعد کے دو بنیادی حصے ہوتے ہیں:

وہ لفظ جو کسی کا نام ہوتے ہیں (اسم)
وہ لفظ جو کسی کام کے کرنے یا ہونے کو
ظاہر کرتے ہیں (فعل)

اگر نقشے کے ذریعے بات کہی جائے تو کچھ اس طرح ہوگی:

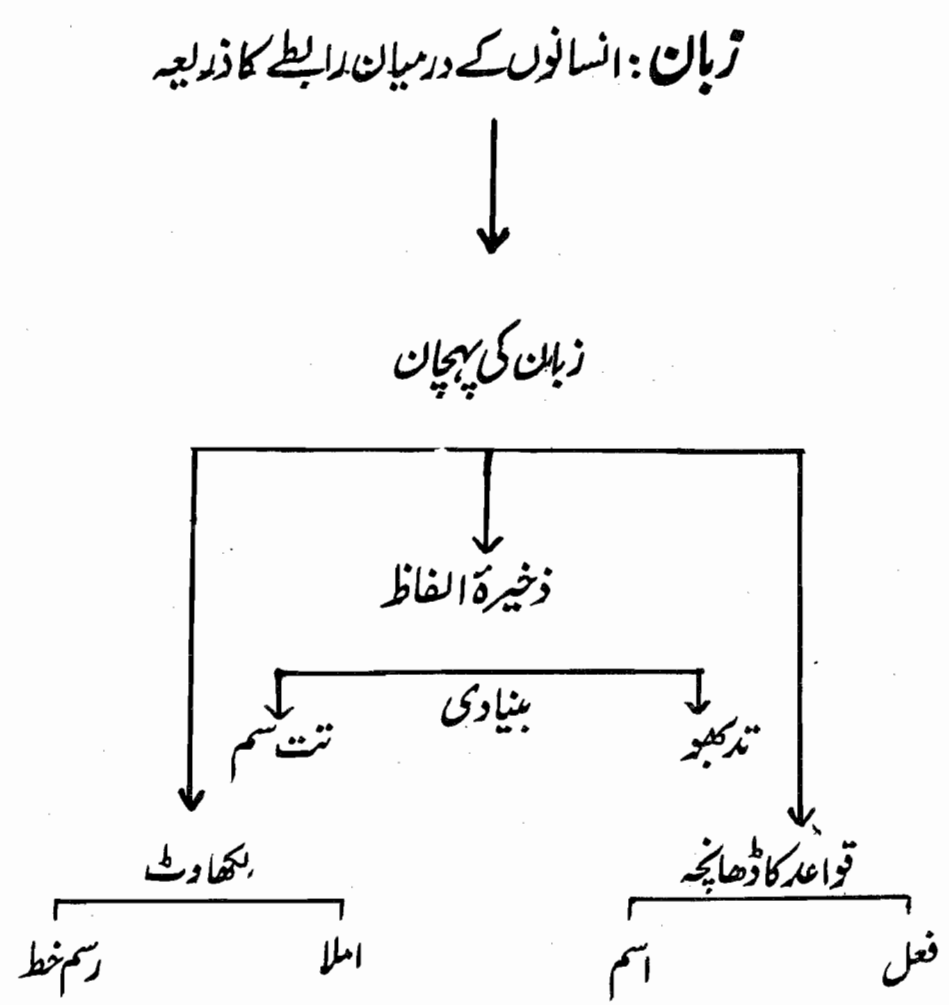

۱-۳ اردو زبان کیا ہے؟

ہندوستان کی سرحدیں جیسی آج ہیں ہمیشہ ایسی نہ تھیں۔ اشوک کے زمانے سے انگریزوں کے آنے تک اس کی سرحدیں افغانستان تک پھیلی ہوئی تھیں اور مغربی اور وسطی ایشیا کے راستوں سے ہندوستان کی چیزیں یورپ تک پہنچتی تھیں۔ اس زمانے میں ویزا اور پاسپورٹ تو تھے نہیں تاجر اور سوداگر، صوفی سنت بھی اِدھر سے اُدھر آتے جاتے رہتے تھے وسطی اور مغربی ایشیا سے آنے والے سوداگروں اور صوفی سنتوں کی تعداد زیادہ تھی جب محمود غزنوی کے بعد فتح کا سلسلہ شروع ہوا تو سپاہی اور سرکاری افسر بھی بڑی تعداد میں آکر بس گئے۔ غرض اس طرح مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے اور الگ الگ زبانیں بولنے والے آپس میں ملے اور ہندوستان ہی میں مل جل کر رہنے لگے۔

اس زمانے میں یعنی بارہویں اور تیرھویں صدی میں عربی اور فارسی زبانیں پوری دنیا میں تہذیب اور تمدن کی زبانیں سمجھی جاتی تھیں جب ان زبانوں کے بولنے والے بڑی تعداد میں یہاں آکر بس گئے تو ان کے اثر سے ایک ملواں زبان پیدا ہوئی جس کی قواعد یا گرامر کی بنیاد تو ہندوستانی تھی مگر اس نے لفظ اور ادبی مزاج کھل کر فارسی اور تھوڑا بہت عربی سے لیا تھا گویا اس زمانے کے بین الاقوامی یا عالمی اثرات کو قبول کیا تھا۔

یہی زبان پہلے ہندوی پھر ریختہ پھر اردو کہلائی۔

ا۔۳۔۱ لکھاوٹ یا رسم خط اور املا

اردو اپنی لکھاوٹ یا رسم خط سے صاف پہچانی جاتی ہے ہر حرف ایک آواز ہے اور اسی لیے جن زبانوں سے اردو نے اثر قبول کیا ہے ان کی خاص خاص آوازیں اور ان کو ظاہر کرنے والے حروف بھی لے لیے ہیں گو ان کی اصل آوازوں کو اردو بولنے والوں نے اپنے مزاج کے مطابق ڈھال لیا ہے۔

اسی لیے آپ کو اردو میں بظاہر ملتی جلتی آوازوں کے لیے ایک سے زیادہ حرف ملیں گے مگر ایسا اس لیے ہوا ہے کہ ان میں سے ایک اپنی اصل زبان کی کسی خاص آواز کو ظاہر کرنے کے لیے تھا جس آواز کو اردو والوں نے اپنے ڈھنگ سے بولنا شروع کر دیا اصل حرف تو رہ گیا مگر اس کی آواز بدل گئی۔

مثال کے طور پر 'ا' اور 'ع' اگر آپ نے کسی عرب کو 'ع' والا کوئی لفظ بولتے سنا ہے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ وہ 'ع' کو حلق کی گہرائی کے ساتھ نکالتے ہیں اور اردو والوں نے اسے 'الف' کی طرح ادا کیا۔

قصہ مشہور ہے کہ ایک عربی داں مولوی صاحب شیرا لینے بازار گئے دکاندار سے انہوں نے پوچھا 'شیرا ہے یا نہیں'، مگر شیرا کے الف کو انہوں نے 'ع' کی طرح بہت کچھ کھینچ کر حلق سے ادا کیا۔

دُکان دار نے کہا "ہو گا تو سہی مگر اتنا گاڑھا نہیں ہے۔"

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اردو نے رسم خط اپنے طور پر ڈھالا۔ فارسی اور عربی رسم خط میں اپنی ضرورت کی آوازیں ظاہر کرنے کے لیے حرف بڑھا لیے مثلاً ٹ، ڈ، ڑ وغیرہ آوازیں نہ فارسی میں ہیں نہ عربی میں یہ ہندوستانی آوازیں ہیں اور ان کے لیے اردو رسم خط نے نئے حرف ڈھال لیے اسی لیے دو آوازوں کو ملا کر بھ، ٹھ، ڈھ بنا لیے گئے۔

اسی طرح اُردو رسم خط میں تین قسم کے حروف ملیں گے:

ایک وہ جو عربی اور فارسی رسم خط میں ہندوستانی آوازوں کو ظاہر کرنے کے لیے اضافہ کر لیے گئے ہیں مثلاً ٹ، ڈ وغیرہ۔

دوسرے وہ جو عربی یا فارسی کی آوازوں کو ظاہر کرتے تھے مگر اب ان کی آوازیں بدل کر ہندوستانی اردو کے لہجے میں ڈھالی گئی ہیں مثلاً ذ، ض، ع وغیرہ۔

تیسرے وہ جو عام آوازوں کو ظاہر کرتے ہیں مثلاً ا۔ ب وغیرہ۔

اب ایک آخری بات۔ اِملا کے بارے میں کر لیں۔

اِملا کسی زبان کے لکھے جانے کے طریقے کا نام ہے اردو کا عام قاعدہ یہ ہے کہ لفظ جہاں تک ہو سکے الگ الگ لکھے جائیں۔ پُرانے لوگ اس قاعدے کی زیادہ پابندی نہ کرتے تھے مثلاً وہ آئے گا کو "آئیگا" اور جائے گا کو "جائیگا" لکھتے تھے۔ فارسی میں اب بھی ایسے تمام لفظوں کو ملا کر لکھنے کا دستور ہے جن کے ٹکڑے کوئی الگ مطلب ادا نہ کرتے ہوں۔

اردو اِملا کی ایک اور خاص بات ہے ایسے لفظوں کو جو عربی یا فارسی سے لیے گئے ہیں ان کی اصلی آوازیں ظاہر کرنے والے حرفوں سے لکھنا مگر علم کو اردو والے اِلم بولتے ہیں لیکن یہ لفظ چونکہ عربی سے آیا ہے اس لیے اسے الف سے نہیں ع ہی سے لکھتے ہیں اسی طرح اور بھی بہت سے لفظ ہیں خود لفظ بھی چونکہ عربی سے اسی شکل میں آیا ہے اس لیے اسے 'لفز' نہیں، لفظ ہی لکھتے ہیں جو اس کی اصل عربی شکل ہے۔

مشق I

۱ - اردو رسم خط کے حروف نیچے دیے جا رہے ہیں ان میں ایسے حرف کون سے ہیں جن کی آوازیں یا جن سے ملتی جلتی آوازیں اسی رسم خط کے دوسرے حروف بھی ادا کرتے ہیں:

ا ب پ ت ٹ ث ج چ ح خ د ڈ ذ ر ڑ ز ژ س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک گ ل م ن و ہ ھ لا ء ی ے

۲ - اردو الفاظ کی تین بنیادی اقسام گنوائیے:

۳ - اردو املا کی دو اہم خاص باتیں کیا ہیں؟ (۱) _____

(۲) _____

۴ - مندرجہ ذیل میں سے کون سے لفظوں کا املا درست ہے اور کن کا غلط؟

لفز	(لفظ)
اقل	(عقل)
عشق	(اشق)
تاجب	(تعجب)
تعریف	(تاریف)
تامیر	(تعمیر)
ہیران	(حیران)
ارنی	(عربی)
مطلب	(متلب)
مضمون	(مزمون)
طرطیب	(ترتیب)

(جواب آخر میں درج ہیں اپنے جوابات ملائیے)

۱-۳-۲ لفظوں کا خزانہ

اب آپ اس سبق کے اس حصّے پر پہنچ گئے ہیں جو لفظوں کے بارے میں ہے:

ہم نے بات شروع کی تھی۔ ایک ایسی صبح کو جب دھوپ کھلی ہوئی تھی موسم نہ زیادہ گرم تھا نہ سرد۔ آپ نہا دھو کر ناشتہ کرنے کے بعد سبق پڑھنے کے لیے کرسی پر بیٹھے تھے۔ سامنے کی میز پر آپ نے کاغذ یا کاپی رکھی تھی کہ کوئی بات لکھنے یا نوٹ کرنے کی ہو تو کاغذ اور کاپی ڈھونڈھنی نہ پڑے۔ پنسل یا بال پین، قلم اور روشنائی بھی موجود تھی۔ میز پر صاف ستھرا میز پوش بچھا تھا اور اس کے ایک کنارے گھڑی یا ٹائم پیس رکھی ہوئی تھی۔

مگر ان جملوں کو غور سے پڑھیے۔ آپ کو اندازہ ہو گا کہ یہ جملے مختلف زبانوں سے لیے ہوئے لفظوں کا خزانہ ہیں۔ اس کے لفظ سنسکرت یا مختلف ہندوستانی زبانوں کے ذریعے آئے ہیں۔ سبق کا لفظ عربی ہے، حصّہ عربی ہے، یہی حال لفظ کا ہے۔ بارہ فارسی ہے، پہنچ گئے ہیں یا میں اور ہے کے لفظ بھی ٹھیٹھ ہندوستانی زبانوں کے ہیں۔ اسی طرح گنتے جائیے آپ کو اندازہ ہو گا کہ بول چال کی زبان مختلف زبانوں سے بے جھجک لفظ لیتی جاتی ہے۔

اردو کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ دوسری زبانوں سے لفظ لینے اور انہیں اپنانے میں بہت کھلے دل کی ہے جو لفظ جہاں کام کا نظر آیا لے لیا اس کے بڑھنے پھلنے پھولنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ اردو نے لفظ جوں کا توں بھی لیے ہیں یعنی تت سم شکل میں (اس کا ذکر ۲-۱ میں آچکا ہے) اور ان میں اپنی ضرورت اور مزاج کے مطابق تبدیلیاں بھی کی ہیں یعنی انہیں اپنا بھی لیا ہے اور اپنایا بھی ہے ایسے لفظ تدبھو کہے جاتے ہیں مثالیں آپ کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں۔

تدبھو والی یہ بات اتنی عام ہے کہ اردو کو تدبھو والی زبان کہا جائے تو نامناسب نہ ہو گا۔ سنسکرت سے گھرت آیا اردو نے گھی

بنالیا، سنسکرت سے چکر کا لفظ آیا اردو نے اسے چکّر بنالیا، راتری آیا اردو میں آکر رات ہوگیا یہی حال فارسی اور عربی سے آنے والے لفظوں کا ہے جیسے موسم سے موسم بن گیا، ترکی کے لفظ بیگم سے بیگم بن گیا، انگریزی کے لفظ لینٹرن کا لالٹین اور رپورٹ کا رپٹ بن گیا۔

تدبھو لفظوں کی آوازیں اور ان کے ادا کرنے کا طریقہ ہی نہیں بدلا ان کے معنی مطلب بھی بدل گئے 'تماشا' لفظ عربی کا ہے وہاں اس کا مطلب ساتھ ساتھ چلنے کا تھا وہاں سے فارسی میں آیا تو دیکھنے کے معنوں میں استعمال ہونے لگا غالب نے بھی اپنے ایک شعر میں اسے انہیں معنوں میں استعمال کیا ہے۔

تماشا کر، اے محو آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

یعنی آئینہ میں اپنی شکل وصورت دیکھنے والے ذرا ہماری طرف بھی دیکھ کہ ہم تجھے کس تمنا سے دیکھ رہے ہیں اردو میں یہ لفظ آیا تو اس کے معنی کھیل کود کے ہوگئے کھیل تماشا۔

آیئے ایک بار اوپر کے جملوں پر پھر ایک نظر ڈالیں ان میں ایسے لفظوں پر نشان لگا دیے گئے ہیں جو دوسری زبانوں سے آئے ہیں مثال کے طور پر:

عربی سے : صبح، شروع، قلم، سبق، لفظ
فارسی سے : روشنائی
پرتگالی سے : میز
انگریزی سے : ٹائم پیس، کاپی، پنسل، بال پین

ان میں آپ کو مرکب لفظ بھی ملیں گے جیسے میز پوش۔ اب میز پرتگالی سے آیا ہے اور 'پوش' لگا کر نئے لفظ بنانے کا طریقہ فارسی سے آیا ہے۔ اردو نے ان دونوں کو ملا کر نیا لفظ میز پوش بنالیا یعنی میز کو ڈھکنے والا کپڑا۔

نئے لفظ بنانے کا ایک اور طریقہ بھی اپنایا گیا جو تھا دو لفظوں

کو ایک علامت یعنی اضافت کے ذریعے جوڑنے کا طریقہ جیسے دریا کے کنارے کہنے کے بجائے کنارِ دریا لکھنا یا گلاب کی خوشبو کے بجائے بوئے گل کہنا، اس قسم کے لفظ عام طور پر فارسی ہی سے بنائے گئے مگر غیر فارسی اور فارسی لفظوں کے بیچ اضافت بڑھا کر نئے لفظ بول چال میں بہت ہیں جیسے لبِ سڑک یعنی سڑک کے کنارے۔

نئے لفظ بنانے اور ان سے مرکب تیار کرنے کے کئی طریقے آپ آگے سیکھیں گے۔ یہاں اردو کی یہ پہچان کافی ہے کہ اس کے الفاظ کے ذخیرے میں بنیادی لفظوں اور تت سم اور تدبھو لفظوں کے علاوہ نئے لفظ ڈھالنے اور ملواں لفظ بنانے کی بھی گنجائش ہے۔

اپنا امتحان خود لیجیے II

(۱) تت سم کسے کہتے ہیں؟

(الف) اس لفظ کو جو کسی زبان سے جوں کا توں لے لیا جائے۔
یا (ب) اس لفظ کو جو کسی دوسری زبان سے لیا جائے اور اس میں تبدیلیاں کر لی جائیں۔

(۲) تدبھو کسے کہتے ہیں؟

(الف) کسی دوسری زبان سے جوں کا توں لیا ہوا لفظ۔
یا (ب) کسی دوسری زبان سے تبدیلیوں کے ساتھ اختیار کیا ہوا لفظ۔

(۳) اضافت کسے کہتے ہیں؟ . . . . . .

(۴) نیچے دیے ہوئے لفظوں کو اضافت کے ذریعے جوڑیئے:
دل کا درد، محفل کا چراغ، ایمان کا نور، ہند کی خاک، شب کی ظلمت

(۵) نیچے دیے ہوئے جملوں میں جو بات کہی گئی ہے کیا اسے کسی دوسرے ڈھنگ سے بھی کہا جا سکتا ہے۔ اپنے طور پر لکھیے:
صبح ہو گئی، دھوپ کھلی ہوئی ہے، موسم نہ زیادہ گرم ہے نہ سرد، رات

کی ظلمت کافور ہو چکی ہے۔ (جواب آخر میں دیے گئے)

۱-۳-۳ قواعد یا گرامر

اردو زبان کی ایک اور پہچان اس کی قواعد یا گرامر سے ہوتی ہے "یہ آتا ہے، جاتا ہے" والی زبان ہے اس کے جملوں میں عام طور پر پہلے فاعل پھر مفعول اور پھر فعل ہوتا ہے اور فعل اکثر صورتوں میں ایک لفظ سے زیادہ ہوتا ہے یعنی مرکب ہوتا ہے۔ یہ سب باتیں آگے کی اکائیوں میں آئیں گی یہاں ہم ان پر صرف اردو زبان کی پہچان کے طور پر غور کریں گے:

ہر جملے کے تین ٹکڑے ہوتے ہیں:

- جس میں کسی کام کے ہونے یا کرنے کا بیان کیا جاتا ہے اسے فعل کہتے ہیں جیسے حامد کتاب پڑھ رہا ہے میں "پڑھ رہا ہے" کے الفاظ
- جس میں کسی کام کرنے والے کا ذکر ہوتا ہے اسے فاعل کہتے ہیں۔ جیسے "حامد"
- جس میں کسی ایسے کا ذکر ہوتا ہے جس پر اس کام کا اثر پڑتا ہے اسے مفعول کہتے ہیں۔ جیسے کتاب۔

اُردو کے جملوں کی عام طور پر یہی ترتیب ہوتی ہے، پہلے فاعل پھر مفعول اور آخر میں فعل۔

اب ایک بار پھر ان جملوں کو دیکھیے جن سے ہم نے بات شروع کی تھی:

صبح ہو گئی ہے، دھوپ کھلی ہوئی ہے، موسم نہ زیادہ گرم ہے نہ زیادہ سرد۔ آپ نہا دھو کر ناشتہ کر کے سبق پڑھنے کے لیے کرسی پر بیٹھے ہیں سامنے کی میز پر آپ نے کاغذ یا کاپی رکھ لی ہے۔

ان میں سے اکثر جملوں کی آپ کو یہی ترتیب نظر آئے گی۔ کچھ جملے ایسے بھی ملیں گے جن میں فعل اور فاعل تو ہیں مفعول نہیں ہے جیسے موسم نہ زیادہ گرم ہے نہ زیادہ سرد۔

اب دوسری پہچان کی طرف آیئے۔ فعل بھی کئی طریقے کے ہوتے ہیں۔

اور فعل کے کرنے والے یا فعل کا اثر لینے والے بھی کئی طرح کے ہوتے ہیں۔

جہاں تک فعل کا تعلق ہے یہ زمانے سے خالی نہیں ہوتا۔ یعنی یہ بتاتا ہے کہ کام ہو چکا ہے، ہو رہا ہے یا ہونے والا ہے یعنی اس کا تعلق گزرے ہوئے زمانے (ماضی) سے ہے یا موجودہ زمانے (حال) سے یا آنے والے زمانے (مستقبل) سے۔ پھر ان زمانوں کی بھی اپنی اپنی قسمیں ہیں۔ ان کا ذکر یہاں ضروری نہیں ہے۔ زمانے کی ان تینوں حالتوں کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ حامد کتاب پڑھتا تھا پڑھ رہا تھا یا حامد نے کتاب پڑھی تھی۔

زمانۂ ماضی ہے

حامد کتاب پڑھتا ہے یا پڑھ رہا ہے۔ — زمانۂ حال ہے

اور حامد کتاب پڑھے گا۔ — زمانۂ مستقبل ہے

اسی طرح فاعل اور مفعول کی بھی درجہ بندی کی جاتی ہے۔ یہ فاعل اور مفعول چاہے جان دار ہو یا بے جان، اردو میں لازمی طور پر یا تو مذکر ہوں گے یا مونث، اور اردو میں مرد ہو یا عورت کم سے کم گرامر میں دونوں کو برابر کا درجہ حاصل ہے۔ یعنی اگر فاعل مذکر ہوگا تو فعل بھی مذکر ہی استعمال کیا جائے گا۔ اگر فاعل مونث ہوگا تو فعل بھی مونث ہی ہوگا:

حامد کتاب پڑھ رہا ہے۔

اور حامدہ کتاب پڑھ رہی ہے۔

کا فرق ظاہر ہے۔ اس طرح فاعل یا واحد ہوگا یا جمع، یعنی کام کرنے والا یا تو ایک ہوگا یا ہوگی یا پھر کئی ہوں گے یا ہوں گی اس صورت میں فعل بھی واحد ہوگا یا جمع مثلاً:

لڑکا کتاب پڑھ رہا ہے

لڑکے کتاب پڑھ رہے ہیں

اسی طرح

لڑکی کتاب پڑھ رہی ہے

لڑکیاں کتاب پڑھ رہی ہیں

یہاں آپ کو قواعد یا گرامر پڑھانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے، لیکن جب تک آپ زبان کی بناوٹ کی بنیادی باتیں نہ سمجھ لیں اس وقت تک اس کی

پہچان نہیں ہو سکتی اور آپ اسے لکھتے وقت ہچکچائیں گے۔ یہاں اسی لیے کرار کی کچھ باتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جب بھی آپ کوئی جملہ لکھنے لگیں تو دھیان رکھیں کہ فاعل، مفعول اور فعل کی ترتیب ٹھیک ہو اور اس جملے میں جو فعل آیا ہو وہ واحد، جمع اور مذکر مونث کے قاعدے کے مطابق ٹھیک ہو۔

ایک تماشا یہ ہے کہ زندگی میں تو ہم ہر جان دار کے جوڑے کو تھوڑا بہت پہچان لیتے ہیں مثلاً ہاتھی مذکر ہے اور ہتھنی مونث، مگر اُردو میں تو ہر بے جان چیز بھی یا مرد ہوتی ہے یا عورت۔ مثلاً کتاب، قلم، کاغذ، دوات۔ اور اس کا کوئی پکا اصول نہیں۔ اسی وجہ سے اسے سیکھنا مشکل ہے۔ یہ تو ایسی بات ہے جو اردو زبان کے ساتھ ساتھ ہی آپ خود سیکھتے جائیں گے۔

واحد جمع کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ مگر اس معاملے میں کچھ اصول ہیں اردو نے چونکہ سنسکرت، پراکرت وغیرہ کے ساتھ ساتھ فارسی، عربی اور انگریزی سے بھی لفظ لیے ہیں اس لیے واحد سے جمع بنانے کے قاعدے بھی کئی اختیار کر لیے ہیں۔ ایک تو سیدھا سادہ ہندوستانی قاعدہ ہے کہ ی ں (ین) یا 'ئے'، یا 'یاں'، لگا کر جمع بنا لی، جیسے بچہ سے بچے یا بچی سے بچیاں۔

دوسرا قاعدہ عربی کا ہے کہ لفظ کے بیچ میں اور کبھی کبھی لفظ کے شروع اور بیچ دونوں میں الف بڑھا دیا اور جمع بنا لی۔

جیسے عالم سے علماء
یا شجر سے اشجار

تیسرا قاعدہ فارسی کا ہے کہ 'ات' لگا کر جمع بنا لی، جیسے زیور سے زیورات۔

ان قاعدوں سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اُردو زبان نے اپنا چراغ سنسکرت اور ہندوستان کی قدیم اور جدید زبانوں ہی سے نہیں فارسی، عربی، ترکی اور انگریزی سے بھی روشن کیا ہے اور بے جھجک ان سب زبانوں سے اور بہت سی دوسری زبانوں سے اثر قبول کیا ہے۔ یہاں گلشن گلشن کے پھول ہیں، رنگ جدا جدا، خوشبو الگ الگ مگر انہیں ملا کر گلدستہ بنا لیا ہے۔ اُردو

زبان کے قواعد کے ڈھانچے نے۔ یہی اُردو کا مزاج ہے، یہی اُردو کی پہچان ہے اس کے لیے کوئی غیر نہیں سب اپنے ہیں، وہ سب کو اپنا تی ہے مگر اس عمل میں ہر لفظ کو اپنے مزاج اور اپنے سانچے کے مطابق ڈھالتی جاتی ہے۔ زبردستی سے نہیں پیار سے، جبر سے نہیں ضرورت سے۔ اس کی ساری مٹھاس اسی رنگا رنگی اور تراش خراش سے ہے۔ وہ لفظ کے آسانی سے بولے جانے پر زور دیتی ہے اور اسی کے مطابق اس میں تبدیلی کر لیتی ہے۔ آدھی آوازیں نکالنا مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے پوری آوازوں کو اختیار کر لیتی ہے۔ راتری کو رات اور چکر کو چکّر بنا لیتی ہے اور پھر ان لفظوں پر چلن کی مہر لگا دیتی ہے کہ اس کے اپنے ہو گئے چاہے ان کی اصل باہر کی ہو مگر اب وہ اُردو کے اپنے خزانے کا حصّہ ہو گئے اور ان پر اُردو کے قاعدے چلنے لگے یہی اُردو ہے جس کے لیے داغ نے کہا تھا :

۱-۴ اُردو زبان کی ادبی روایت

ہر زبان صرف لفظوں کا ذخیرہ نہیں ہوتی نہ صرف گرامر اور قواعد کا نام ہے نہ صرف لکھاوٹ ہے۔ اس کا اپنا ادب بھی ہوتا ہے۔ اس کی کہانیاں قصّے، گیت اور شاعری، ڈرامے اور ناٹک سبھی ہوتے ہیں اور ان کی اپنی فضا ہوتی ہے، اپنی روایت ہوتی ہے اور اس زبان کا تعلق مختلف تہذیبوں کی روایتوں سے ہوتا ہے۔

اردو نے اپنا تعلق ہندوستان اور ہندوستان کے باہر کی بین الاقوامی روایتوں سے قائم رکھا ہے اسی لیے اس ملواں زبان پر دونوں قسم کے اعتراض کیے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ اسے صرف ہندوستان کی ایسی زبان کی حیثیت سے جانتے ہیں جس کی روایت رسم خط اور لفظوں کا ذخیرہ ہندوستان کی جدید زبانوں سے الگ تھلگ نہ سہی تو بھی مختلف ضرور ہے۔ بعض لوگ اسے غیر ملکی زبان قرار دیتے ہیں جس کا ہندوستان سے بہت کم تعلق ہے۔ دراصل یہ دونوں قسم کے لوگ آج کے ہندوستان کی سرحدوں ہی کو

ہندوستان سمجھتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ ہندوستان کی موجودہ سرحدیں چالیس سال سے زیادہ پرانی نہیں ہیں اور اردو کی عمر اس سے کہیں زیادہ یعنی کم سے کم ۷۰۰/۸۰۰ سال ہے اور سات سو، آٹھ سو سال پہلے ہندوستان کی سرحدیں افغانستان اور ایران تک اور آج کے سوویت روس کے جنوبی علاقوں یعنی وسط ایشیا تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اور انہی سرحدوں میں اُردو پیدا ہوئی اور انہی ذاتروں کی زبانوں سے اس نے اثر قبول کیا۔

سچائی یہ ہے کہ اردو قواعد اور گرامر کے اعتبار سے ٹھیٹھ ہندوستانی زبان ہے، مگر اس نے ادبی روایات کا رشتہ فارسی، عربی، ترکی اور دیگر زبانوں کے ادب سے بھی قائم کیا ہے اور ان سے فیض اٹھایا ہے لیکن اس فیض کو بھی اس طرح اپنے میں رچا بسا لیا ہے کہ ہندوستان کی تہذیب اور زبانوں میں پھیلی ہوئی جڑیں ان اثرات سے اور مضبوط ہوئی ہیں۔

مثال کے طور پر اردو نے غزل کو اپنایا۔ یہ شاعری کی وہ قسم ہے جس میں دو مصرعوں یا ٹکڑوں میں پوری بات کہہ دی جاتی ہے اور اس کی اپنی علامتیں ہوتی ہیں جن سے بہت کچھ مراد لیا جا سکتا ہے۔ کہنے کو تو ذکر شراب اور ساقی کا ہوتا ہے مگر شراب اور ساقی سے سیاسی صورتِ حال بھی مراد لی جا سکتی ہے اور اخلاقی مضامین بھی باندھے جا سکتے ہیں۔ غزل اردو میں فارسی سے آئی، فارسی نے اسے عربی سے لیا تھا مگر اردو نے اس میں جو مضامین باندھے اور جو باتیں بیان کیں وہ ہندوستانی زندگی سے متعلق تھیں یہی انداز دوسری چیزوں کا بھی ہے۔

۱-۵ خلاصۂ بحث

ہم نے اس اکائی میں زبان کے کئی رُخ دیکھے۔ زبان کی پہچان کے تین بنیادی طریقے جانے پہچانے۔ ایک طریقہ رسم خط اور املا یعنی لکھاوٹ کا ہے۔ دوسرا طریقہ الفاظ کے خزانے کا ہے اور تیسرا طریقہ جو شاید پہلے دونوں طریقوں سے زیادہ اہم ہے قواعد یا گرامر کا ہے جو ہر زبان کے لیے بنیادی ڈھانچے کا کام کرتا ہے اور زبان کی پہچان بن جاتا ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ زبان کا تعلق ادب سے بھی ہے اور ہر زبان اپنی ادبی فضا رکھتی ہے اسی ادبی فضا سے روایت بنتی ہے اور زبان کے تہذیبی رشتے سامنے آتے ہیں۔

اس کے بعد ہم نے اردو زبان کا جائزہ لیا، اس کی لکھاوٹ کی خاص خاص باتوں پر غور کیا، اس کے الفاظ کے خزانے میں جس جس قسم کے الفاظ ہیں انہیں پہچاننے کی کوشش کی پھر اس کی قواعد یا گرامری ڈھانچے کی موٹی موٹی باتیں سمجھ لیں اور آخر میں اس کی ادبی فضا اور روایت کی ایک جھلک دیکھی۔

اس سے یہ اندازہ ہوگا کہ اردو ایک ایسی رنگا رنگ تہذیب کا نشان ہے جس میں مختلف ہندوستانی اور وسط اور مغربی ایشیا کی زبانوں کا ملاپ ہوا ہے اور اس لحاظ سے وہ ہماری ملواں تہذیب کی نشانی بن گئی ہے جس کی جڑیں دور دُور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس اکائی کی مدد سے آپ اردو لکھیے اور اپنے خیالات کو اردو میں بیان کریں۔

مشق II

۱- اوپر دیے ہوئے سبق میں آپ نے یہ نئے لفظ سیکھے ہیں لغت میں ان کے معنی دیکھیے اور انہیں اپنے جملوں میں استعمال کیجیے :

فضا، روایت، تہذیب، مضمون، علامت، فیض، اخلاق۔

۲- اردو کے ادبی فضا کی دو اہم باتیں بیان کیجیے :

۳ - مندرجہ ذیل جملے کے بارے میں اپنے خیالات پانچ جملوں میں لکھیے :
اردو ہماری ملی جلی تہذیب کی نشانی بن گئی ہے ۔

مزید مطالعے کے لیے

جوابات
اپنا امتحان خود لیجیے ۔ I

چارٹ جوابات

	بنیادی شکلیں		بنیادی عناصر — لکھاوٹ			بنیادی عناصر — الفاظ			قواعد	
	(۱)	(۲)	(۱)	(۲)	(۱)	(۲)	(۳)	(۱)	(۲)
زبان	بول چال	تحریری	رسم خط	املا	بنیادی	تت سم	تدبھو	اسم	فعل

مشق I

۱ - ت ط - س ص ث - ا اور ع - ہ ح ھ - ی ے
۲ - بنیادی ہندوستانی الفاظ - تت سم اور تدبھو -
۳ - حروف کی آوازوں میں تبدیلی اور نئے حروف کا اضافہ
۴ - لفظ - عقل ، عشق ، تعجب - تعریف ، تعمیر - حیران - عربی ، مطلب -

اپنا امتحان خود لیجیے II

۱ - (الف)

۲ - (ب)

۳ - وہ زیر جو کسی دو لفظوں کے درمیان کا، کی، کے کی جگہ آئے۔

۴ - دردِ دل، چراغِ محفل، نورِ ایمان، خاکِ ہند، ظلمتِ شب۔

۵ - مثلاً سویرا ہوا، سورج نکل آیا، موسم خوشگوار ہے، رات کا اندھیرا ختم ہوا۔

مشق II

۱ - یہ سوال آپ ہی کو حل کرنا ہے۔

۲ - وسط اور مغربی ایشیا کی زبانوں سے اثر لینا اور اسے ہندوستانی فضا میں ڈھالنا۔

۳ - یہ سوال بھی آپ ہی حل کریں گے۔ یہاں مقصد یہ ہے کہ آپ کو اپنی بات سیدھی سادی اردو میں لکھنے کا ڈھنگ کس حد تک آگیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے استعمال کیجیے۔

مزید مطالعے کے لیے

اُردو کیسے لکھیں : رشید حسن خاں

اُردو کی کہانی : احتشام حسین

اکائی ۲ : اُردو کی پہچان۔ سابقے، لاحقے

ترتیب :

۲ — ۰ مقاصد
۲ — ۱ دیباچہ
۲ — ۲ لفظ، اپنے اور پرائے
۲ — ۳ اردو کی پہچان — بے تعصبی
۲ — ۴ نامکمل اور مکمل الفاظ
۲ — ۵ سابقے
۲-۵-۱ نفی کے دوسرے سابقے
مشق I
۲-۵-۲ دیگر سابقے
۲-۵-۳ آزاد اور جوڑی دار سابقے
مشق II
۲ — ۶ لاحقے
۲-۶-۱ کچھ اور استعمال
اپنا امتحان خود لیجیے I
۲-۶-۲ کھلے اور بند لاحقے
۲ — ۷ تعلیقے
اپنا امتحان خود لیجیے II
۲-۷-۱ لاحقوں کا مزید استعمال
۲-۷-۲ لفظوں میں تبدیلیاں
مشق III
۲ — ۸ لفظ جان دار ہوتے ہیں
۲ — ۹ لفظ اور جنس۔ مذکر اور مونث
۲ — ۱۰ واحد، جمع
مشق IV
۲ — ۱۱ جملے میں لفظوں کے رشتے
۲ — ۱۲ خلاصۂ بحث
مزید مطالعے کے لیے
جوابات

۲ ۔۔ مقاصد

پہلے بلاک کی پہلی اکائی میں آپ نے اردو زبان کی پہچان کے بارے میں تین باتوں پر غور کیا :

رسم خط ، قواعد ، اور لفظوں کا ذخیرہ ۔

اس اکائی میں اب قواعد اور لفظوں کے بارے میں کچھ اور باتیں سیکھیں گے ۔

پہلے : لفظ ایک دوسرے سے مل کر کیسے نئے لفظ بناتے ہیں ۔

دوسرے : لفظوں کے اندر تبدیلی ہونے سے کس طرح ان کے معنی بدل جاتے ہیں ؟

تیسرے : جملوں میں لفظ کس طرح ایک دوسرے سے جڑے رہتے ہیں ؟

چوتھے : اس باب کو پڑھنے کے بعد آپ لفظ بنانے کے بنیادی اصول سیکھیں گے ۔ اور خود ضرورت پڑنے پر نئے لفظ بنائیں گے ۔

۲ ۔ ۱ دیباچہ

زندگی جیسے جیسے آگے بڑھتی ہے نئی نئی ضرورتیں پیدا ہوتی ہیں اور ان کے لیے نئے لفظوں کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اس کے لیے کبھی ہم بالکل نیا لفظ بناتے ہیں اور کبھی پرانے لفظوں میں کچھ پھیر بدل کر کے یا گھٹا بڑھا کر کام چلاتے ہیں ۔ دوسری زبانوں کی طرح اُردو میں بھی پرانے لفظوں سے نئے نئے لفظ بنتے رہتے ہیں اور لفظ بنانے کے قاعدے بھی اس کے اپنے ہیں اور یہ بھی اس کی ایک پہچان ہے ۔

۲ ۔ ۲ لفظ اپنے اور پرائے

آپ نے پچھلی اکائی میں دیکھا کہ آپ زندگی میں کوئی کام کیوں نہ کرتے ہوں اور تعلیم کے سلسلے میں سائنس کے طالب علم ہوں یا کامرس کے ، تاریخ پڑھتے ہوں یا جغرافیہ آپ کو اپنے دل کی بات کہنے یا لکھنے کی ضرورت کبھی نہ کبھی ضرور ہوتی ہے ۔ یہ ضرورت جس طرح آپ اپنی زبان میں پوری کر سکتے ہیں اس آسانی کے ساتھ اور اس قدر بھرپور

طریقے پر کسی دوسری زبان میں پوری نہیں کر سکتے۔ اس کی بڑی وجہ بھی یہی ہوتی ہے کہ آپ اپنی زبان کے لفظوں میں تھوڑا بہت پھیر بدل کر کے نئے لفظ بنا سکتے ہیں اور اپنے دل کی بات ادا کر سکتے ہیں۔

دراصل جس طرح اپنا خیال رکھنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی دن رات آئینے کے سامنے بیٹھا اپنی شکل ہی تکتا رہے۔ اسی طرح اپنی زبان یا اپنی مادری زبان سے محبّت اور لگاؤ کا یہ مطلب نہیں کہ دوسری زبانوں سے نفرت کرنے لگے۔ سچ تو یہ ہے کہ جس طرح ہم دوسرے انسانوں سے پیار اور محبت کا برتاؤ کرنے کو رواداری، بے تعصبی اور کشادہ دلی سمجھتے ہیں اسی طرح اپنی زبان کے علاوہ دوسری زبانوں سے بھی محبّت کرنی چاہیئے اور ان کے ضروری لفظوں کو بھی بے تعصبی اور کشادہ دلی سے پورے احترام کے ساتھ اپنی زبان میں جگہ دینی چاہیئے۔ ایسی مثالیں کم یاب ہوں تو ہوں نایاب نہیں ہیں کہ لوگوں نے اپنی زبان کے ساتھ دوسری زبانوں سے بھی پیار اور محبّت کا ثبوت دیا ہے۔

۲-۳ اردو کی پہچان : بے تعصبی

ہم نے دیکھا کہ اردو کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ وہ دوسری زبانوں کے لفظوں کو کھلے دل کے ساتھ لیتی رہی ہے اور انہیں اپنی ضرورت کے مطابق استعمال اور اختیار کرتی رہی ہے۔ اس میں ہندوستان کی زبانوں کے لفظ بھی ہیں (جیسے سنسکرت، مرہٹی وغیرہ کے لفظ) اور وسط اور مغربی ایشیا کی زبانوں کے بھی (جیسے عربی، فارسی اور ترکی کے لفظ) اور یورپ کی زبانوں جیسے انگریزی اور فرانسیسی کے لفظ بھی ہیں۔

ان سبھی لفظوں میں کچھ پھیر بدل کر کے نئے لفظ بناتے گئے ہیں یہ اُردو کی ایک خاص پہچان ہے کہ وہ کسی لفظ کے پیچھے کوئی دوسرا لفظ یا ٹکڑا جوڑنے یا کسی لفظ کے آگے کوئی دوسرا لفظ یا ٹکڑا جوڑنے میں سبھی زبانوں سے لیے ہوئے لفظوں کے ساتھ ایک ہی قسم کا طریقہ برتتی ہے۔ اردو برادری میں اچھوت نہیں ہوتے چھوت چھات کا رواج نہیں ہے ہاں چھوٹے بڑے ضرور ہیں

۲-۴ نامکمل اور مکمل الفاظ

آیئے ۲-۳ کی عبارت کو غور سے پڑھیں اور دیکھیں کہ مصنف کس طرح اس میں ایک کے بعد ایک لفظ رکھتا چلا گیا ہے۔ ہر لفظ جداگانہ اور آزاد ہے لیکن ہم جیسے ہی لفظ 'بے تعصبی' پر پہنچتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لفظ دو حصّوں سے مل کر بنا ہے۔ یہ دونوں حصّے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ ایسے ہی بعض دوسرے الفاظ ہیں۔ کشادہ دلی، نایاب، کم یاب وغیرہ۔ آپ نے دیکھا یہ تمام الفاظ دو دو ٹکڑوں کے ہیں اور مل کر ایک معنی دیتے ہیں۔ ان میں سے پہلے لفظ کو دیکھئے جسے توڑیں تو یوں لکھا جاسکتا ہے:

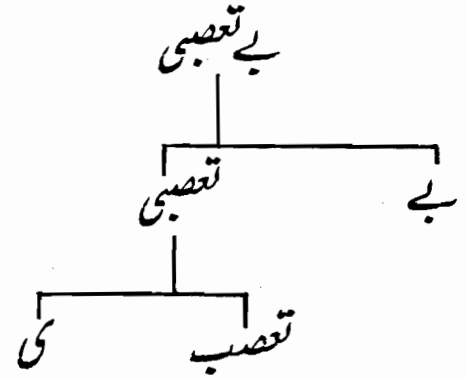

معنی پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اصل لفظ تو 'تعصب' ہے جو اسم ہے اور آزادانہ طور پر استعمال ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے (اسے کلمۂ نفی بھی کہہ سکتے ہیں کیوں کہ اس میں کسی چیز یعنی تعصب کے نہ ہونے کی بات ہے) 'بے' (= نہیں) اس کے شروع میں جوڑا گیا اور "ی" آخر میں۔ یہ دونوں یعنی 'بے' اور 'ی' الگ استعمال نہیں ہوتے۔ دوسرے لفظوں کے ساتھ ہی مل کر استعمال ہوتے ہیں، لیکن ان کے ملنے سے لفظ کے معنی بدل جاتے ہیں۔ یعنی جب یہ کسی لفظ کے ساتھ ملتے ہیں تو ایک نیا لفظ بن جاتا ہے۔

۲-۵ سابقے

اصل لفظ سے پہلے اس قسم کا کوئی لفظ جوڑ دیا جائے تو اسے سابقہ کہتے ہیں اور اصل لفظ کے بعد اس قسم کا کوئی لفظ جوڑ دیا جائے تو اسے

لاحقہ کہا جاتا ہے۔

تعصب اسم ہے۔ لیکن جیسے ہی اس میں "بے" کا اضافہ ہوا اس میں دو تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ پہلے تو یہ اسم سے صفت بنا یعنی یہ پہلے کسی چیز کا نام تھا (اسم) اب وہ چیز کیسی ہے یا آدمی کیسا ہے اسے بتانے لگا (صفت) اور دوسرے اس کے معنی منفی ہو گئے۔ یعنی "وہ شخص جس میں تعصب نہ ہو"۔ 'بے' جو کلمہ نفی ہے اور کبھی بہت سے لفظوں کے ساتھ مل کر ایسے ہی معنی دیتا ہے جیسے :

بے + کار = بے کار (جسے کوئی کام نہ ہو۔)

بے + ضرر = بے ضرر (جو ضرر یعنی نقصان نہ پہنچا سکے)

بے + بہا = بے بہا (جس کی کوئی بہا یعنی قیمت) نہ ہو بہت قیمت والا)

بے + سود = بے سود (جس کا کوئی سود یعنی نفع نہ ہو)

بے + یار و مددگار = بے یار و مددگار (جس کا کوئی یار و مددگار نہ ہو)

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ایسا لفظ یا ٹکڑا جو دوسرے لفظ کے شروع میں جوڑا جائے سابقہ کہلاتا ہے (اوپر کی مثالوں میں 'بے' سابقہ ہے)

۲-۵- نفی کے دوسرے سابقے

'بے' جو سابقہ ہے، نفی کے معنی دیتا ہے۔ اردو میں ایسے اور بھی سابقے استعمال ہوتے ہیں جو نفی کے لیے آتے ہیں۔ لیکن ان سے وہی سب معنی پیدا نہیں ہوتے جو "بے" سے ہوتے ہیں، ان کو 'بے' کی جگہ استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ چند ایسے سابقے دیکھیے :

(۱) نا : ناقابل، نامناسب، ناہذب وغیرہ لفظوں میں۔

(۲) اَ : اٹل، اچھوت، امٹ وغیرہ لفظوں میں۔

(۳) ان : اَن پڑھ، اَن مول، اَن گنت وغیرہ میں۔

(۴) بلا : بلا شرکت، بلا وجہ، بلا سبب وغیرہ میں۔

(۵) غیر : غیر حاضر، غیر ممکن، غیر ذمہ دار وغیرہ میں۔

(۶) لا : لاپتہ، لاپرواہ، لازوال وغیرہ میں۔

(۷) ن : ننگا، ننھا، ناڑھال وغیرہ ہیں۔

ان پر غور کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ ان سابقوں کو برتنے کے قاعدے میں بھی اردو نے سنسکرت، عربی اور فارسی، ترکی وغیرہ سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ مثال کے طور پر اٹل، امنول وغیرہ میں اَ لگا کر نفی کا سابقہ بنانے کا قاعدہ

مشق ۱

۱۔ نئے لفظوں کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے؟

۲۔ پُرانے لفظوں سے نئے لفظ بنانے کے عام طریقے کیا ہیں؟

۳۔ اُردو نے مختلف زبانوں سے جو لفظ لیے ہیں ان سے نئے لفظ بنائے ہیں یا نہیں؟

۴۔ مکمل اور نامکمل لفظ سے کیا مراد ہے؟

۵۔ سابقہ کسے کہتے ہیں؟

۶۔ ایسے پانچ لفظ لکھیے جن میں "بے" کا سابقہ لگا کر کوئی لفظ بنایا گیا ہو۔

_____

_____

_____

_____

_____

اس حصّے تک پہنچتے پہنچتے آپ تھک گئے ہوں گے تھکن دُور کرنے کی بہت سی تدبیریں ہیں۔ کچھ لوگ چائے پی کر تھکن دُور کرتے ہیں۔ اگر آپ کی تھکن چائے کی پیالی سے دُور ہوتی ہو تو ایک پیالی چائے ضرور پی لیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں چائے بے ضرر ہے، مگر کچھ کا خیال ہے کہ یہ ضرر رساں ہے۔ کچھ لوگ تھکن اس طرح دُور کرتے ہیں کہ جو کام کر رہے ہوں اس سے بالکل مختلف کام کرنے لگتے ہیں مثلاً پڑھتے پڑھتے گانا گانے لگنا یا ڈرائنگ

کرنے لگنا۔ یہ اسی طرح کے کام ہیں جیسے اصل لفظ کے پہلے یا بعد میں لفظ جوڑ کر کام چلانا اور ان سے نئے لفظ بنانا۔

اسی لیے ایک صاحب کا تو یہاں تک خیال تھا کہ ہر کام سے پہلے چائے ہونی چاہیئے (یعنی سابقہ) اور ہر کام کے بعد چائے ہونی چاہیئے (یعنی لاحقہ) بیچ میں کچھ ہو یا نہ ہو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ خیر یہ تو مذاق کی بات تھی۔

'بے' والے سابقوں سے بننے والے لفظ ہم نے دیکھے۔ آیئے اب کچھ اور لفظ بھی دیکھیں شاید ان سے اردو کی پہچان میں مدد ملے مثلاً کشادہ دِلی۔

نایاب (سابقہ) نا + یاب = جو مل نہ سکے

کم یاب (سابقہ) کم + یاب = جو کم مل پائے

ان میں سے ہر سابقہ اور بہت سے الفاظ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے جیسے :

کشادہ : کشادہ دست (سخی) کشادہ قلب = حوصلہ مند
کشادہ جبیں۔

در : دراصل، درپردہ، درآمد

نا : نازیبا، ناروا، نارسائی

کم : کمزور، کمسن، کم ظرف

۲-۵-۳ آزاد اور جوڑی دار سابقے

آپ نے سائنس میں ایسے کیڑوں کا حال پڑھا ہوگا جو دوسرے جسموں کے سہارے ہی زندہ رہتے ہیں وہ اپنے طور پر غذا حاصل نہیں کرتے۔ دوسرے جو کچھ کھاتے پیتے ہیں انھیں میں یہ حصّہ بٹا لیتے ہیں یہی حال کچھ لفظوں کا بھی ہوتا ہے کچھ سابقے آزاد بھی ہوتے ہیں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا الگ کوئی مطلب نہیں ہوتا۔

اُردو میں اور بھی بہت سے سابقے استعمال ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض وہ ہیں جو علیٰحدہ آزاد لفظ کے طور پر بھی استعمال ہوتے ہیں، بعض

کا استعمال علیحدہ لفظ کے طور پر نہیں ہوتا۔ صرف سابقہ طور پر ہوتا ہے۔ ذیل میں چند سابقے دیکھیے:

(الف) چند ایسے سابقے جو علیحدہ آزاد لفظ کے طور پر بھی استعمال ہوتے ہیں، الگ استعمال ہو تو 'پیش' کے معنی آگے کے ہیں:

پیش : پیش بندی، پیش قدمی، پیش رفت۔

خود : (بمعنی اپنے آپ) خود پرست، خود غرض، خود کشی۔

خوش : (بمعنی سکھی، مسرور) خوشبو، خوش رنگ، خوش حال۔

سَر : سَرچڑھا، سَرپرست، سرسبز۔

یک : (بمعنی ایک) یک زبان، یک جا، یک سال

(ب) چند ایسے سابقے جو اردو میں آزاد لفظ کے طور پر استعمال نہیں ہوتے۔ جب بھی آتے ہیں کسی دوسرے لفظ کے جوڑی دار بن کر آتے ہیں۔ اگر جوڑی دار نہ ہوں تو الگ سے ان کے کوئی معنی نہیں:

با : بااثر، باخبر، باقاعدہ

بر : برآمد، برآمدہ، برخلاف

ت : تپارہ، تپائی، ترا ہا

ک : کپوت

س : سڑول، سپوت

اَ : اٹل

ہم : ہم پیشہ، ہمسایہ، ہموطن

مشق II

اوپر جو سابقے دیے گئے ہیں، ان سے بننے والے دو دو لفظ اور لکھیے:

_____

_____

_____

۲- ایسے سابقوں کی پانچ مثالیں دیجیے جو آزادانہ طور پر بھی استعمال ہوتے ہیں۔

۳- ایسے سابقوں کی پانچ مثالیں دیجیے جو آزادانہ طور پر استعمال نہیں ہوتے۔

(جواب آخر میں دیے گئے ہیں ان سے مقابلہ کیجیے)

۲-۶ لاحقے

۲-۴ میں 'بے تعصبی' کو ٹکڑوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ یعنی :

بے تعصبی = بے + تعصب + ی ۔ اور بتایا گیا تھا کہ "تعصب" اصل لفظ ہے جس میں 'ی' جوڑی گئی ہے۔ "بے تعصب" صفت تھا جس کے معنی تھے وہ شخص جو تعصب نہ کرتا ہو، لیکن 'ی' آخر میں بڑھائی تو یہ لفظ پھر اسم بن گیا۔ یعنی "تعصب نہ کرنے کی کیفیت"۔ گویا اس ی نے لفظ کے معنی کو بدل دیا۔ لفظ کے آخر میں اس طرح کے ٹکڑے جوڑے جائیں تو لاحقہ کہلاتے ہیں۔ یہاں 'ی' لاحقہ ہے۔ اسی 'ی' نے 'کشادہ دل' سے 'کشادہ دلی' بھی بنا دیا۔

مندرجہ ذیل الفاظ میں اسی لاحقہ 'ی' کا استعمال ہوا ہے۔

خوشنودی = خوشنود + ی

غلطی = غلط + ی

خوشی = خوش + ی

ایمانداری = ایمان + دار + ی

قدردانی = قدر + داں + ی

قدرشناس = قدر + شناس + ی

یہاں خوشنود، غلط، خوش، ایمان، قدر اور قدر بنیادی لفظ ہیں۔ پہلے تین صفت ہیں۔ ان میں براہِ راست لاحقہ ی جوڑا گیا، جس سے یہ اسم بن گئے۔ آخر کے تین لفظ اسم ہیں۔ ان میں ترتیب وار پہلے دار، داں اور شناس جوڑے گئے، جس سے یہ صفت بنے۔ تب ان میں اسمی لاحقہ ی جوڑ دیا گیا۔ اس بات کو اس نقشے سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔

اسم ⟵	صفت ⟵	اسم
ایمان	ایماندار	ایمانداری
قدر	قدرداں	قدردانی
قدر	قدرشناس	قدرشناسی
...	خوشنود	خوشنودی
...	غلط	غلطی
...	خوش	خوشی

۲-۶-۱ کچھ اور استعمال

آخر میں 'ی' لگا کر لاحقے کا اور بھی کئی طریقے پر استعمال کیا جا سکتا ہے اس کی کچھ مثالیں دیکھیے :

سرکاری = سرکار + ی
ملکی = ملک + ی
قومی = قوم + ی

یہاں اصل لفظ اسم ہے۔ اس میں لاحقہ ی شامل ہونے سے صفت بن گیا :

اسم + ی ⟵	صفت
سرکار	سرکاری
ملک	ملکی
قوم	قومی

ی لاحقہ بظاہر ایک ہوتے ہوئے بھی دو الگ الگ کام کرتا ہے اس لیے ہم اس کو ایک نہ مان کر دو الگ لاحقے تصور کریں گے پہلی صورت میں ہم اسے

اسمی لاحقہ اور دوسری صورت میں صفتی لاحقہ کہیں گے۔

اسی طرح کچھ دوسرے لاحقے دیکھے جن میں اصل لفظ کے آخر میں کچھ جوڑا گیا ہے اور اس طرح جوڑنے سے نیا لفظ بن گیا ہے۔ گویا یہ سابقے کی طرح کا وہ ٹکڑا ہے جو اصل لفظ کے شروع کے بجائے آخر میں لگایا گیا ہے مثال کے طور پر :

کنارہ کش = کنارہ + کش (لاحقہ)

بے تعصبانہ = (سابقہ بے + تعصب + - انہ (لاحقہ)

ایمانداری = ایمان + دار (لاحقہ) + - ی (لاحقہ)

ذمہ داری = ذمہ + دار (لاحقہ) + - ی (لاحقہ)

جواب دہ = جواب + دہ (لاحقہ)

ان الفاظ میں استعمال ہونے والے لاحقوں کی فہرست درج ذیل ہوگی :

- کش - ی
- انہ - وار
- دار - دہ

ان میں سے ہر لاحقہ دوسرے متعدد لفظوں کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اور ان کے معنی میں اضافہ کرتا ہے۔ آپ نے بہت سے الفاظ پڑھے ہوں گے۔ جن میں ان لاحقوں کا استعمال ہوا ہے۔ چند الفاظ مثال کے طور پر درج ذیل ہیں :

- کش : آرہ کش، دل کش، فاقہ کش
- انہ : مردانہ، سالانہ، روزانہ
- دار : پھلدار، سایہ دار، رازدار
- ی : ابتری، گرمی، جوانی
- دہ : نقصان دہ، آرام دہ، تکلیف دہ

اپنا امتحان خود لیجیے I

۱۔ لاحقہ کسے کہتے ہیں ؟ (الف) کسی لفظ کے شروع میں بڑھائے جانے والے لفظ

کو یا (ب) کسی لفظ کے آخر میں بڑھائے جانے والے لفظ کو

۲- نیچے دیے ہوئے لفظوں کے لاحقے بتائیے :

ایمان داری ، فرقہ وارانہ ، صنعتی ، بازاری ، نامی

ہندوستانی ، سرکاری ، درباری ، ظاہری ، باطنی

۳- پانچ ایسے لاحقے لکھیے جو اصل لفظ سے الگ بھی کوئی معنی رکھتے ہیں ؟

۴- اسمی لاحقہ کسے کہتے ہیں ؟

۵- صنعتی لاحقے کی پانچ مثالیں لکھیے :

کھلے اور بند لاحقے

اب ذرا ایک اور ڈھنگ سے لاحقوں اور سابقوں پر نظر ڈالیے ان میں آپ کو دو قسم کے لاحقے اور سابقے ملیں گے۔ ان میں سے ہر ایک میں ایک بنیادی (مرکزی) لفظ ہے اور اس سے پہلے سابقہ اور اس کے بعد لاحقہ جوڑا جا سکتا ہے۔ لاحقے کے بعد دیگرے ایک سے زیادہ بھی جوڑے جا سکتے ہیں، جیسے ایمانداری اور ذمہ داریوں میں اور ہر مرتبہ لفظ کی نوعیت بدلتی چلی جاتی ہے، لیکن ایک منزل ایسی آجاتی ہے جس کے بعد مزید لاحقہ جوڑنا ممکن نہیں ہوتا۔ پہلی صورت کو جہاں مزید لاحقہ جوڑنا ممکن ہو ہم 'کھلے' کہہ سکتے ہیں اور دوسری صورت کو جہاں مزید لاحقہ جوڑنا ممکن نہ رہے انہیں 'بند' سابقے یا لاحقے قرار دے سکتے ہیں۔ ایسی دو مثالیں لیجیے:

ا- ایمان + دار			
	ایمان دار + ی		
		ایمانداری + ں	
			ایمانداریاں

ب۔ ذمہ + دار → ذمہ دار + ی → = ذمہ داری
ذمہ دار + واں/-اں → = ذمہ داریوں/ذمہ داریاں

دونوں صورتوں میں دوسرے لاحقے تک 'کھلا لاحقہ' ہے یعنی اس میں تیسرے لاحقے کی گنجائش ہے مگر تیسرے لاحقے کے بعد کوئی اور لاحقہ جوڑنا ممکن نہیں اور 'بند' لاحقے کی منزل آجاتی ہے۔ اسی مثال میں دوسرے کے بعد بھی 'بند لاحقہ' ہو سکتا ہے :

ا۔ ایمان + دار → ایماندار + وں → = ایمانداروں

ب۔ ذمہ + دار → ذمہ دار + وں → = ذمہ داروں

اس تیسری صورت کے بعد کوئی لاحقہ جوڑنا ممکن نہیں ہے۔

۲-۷ تعلیقے

آپ نے دیکھا کہ سابقوں اور لاحقوں سے بننے والے لفظوں کے نظام میں ایک لفظ مرکزی ہوتا ہے اور اس سے پہلے (سابقہ) یا بعد میں (لاحقہ) کوئی ٹکڑا یا لفظ جوڑ کر کوئی اور لفظ بنا لیا جاتا ہے۔ اس طرح ایک ہی لفظ سے نئے نئے معنی یا ایک ہی معنی کے نئے پہلو ظاہر کرنے والے لفظ بنتے چلے جاتے ہیں۔ آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ اس طرح بننے والے ملواں لفظوں کے معنی کبھی بالکل دو اور دو چار کی طرح صاف اور سیدھے ہوتے ہیں اور کبھی ان کے معنی بدل جاتے ہیں۔

اس مثال پر غور کیجیے : کتاب سے کتابوں یا کتابیں بنا۔ (کتاب اسم ہے) - وں جمع کا لاحقہ ہے۔

ان دونوں کو جوڑ کر جو لفظ 'کتابوں' بنا، یہ لفظ ان دونوں کے معنوں سے مِل کر بنے ہیں اور بس۔ نہ معنی میں کوئی کمی بیشی، نہ لفظ کی حالت میں کوئی تبدیلی۔

لیکن دوسرے بہت سے لفظوں میں یہ صورت نہیں ہوتی اور مِل کر بننے والے لفظ کے معنی اپنے ٹکڑوں کے معنی سے آگے بڑھ جاتے ہیں کہیں زیادہ ہو جاتے ہیں اور کہیں مختلف۔ اس تبدیلی میں لفظ کبھی اسم سے صفت اور کبھی صفت سے اسم اور کبھی کوئی دوسری حالت اختیار کر لیتا ہے۔

اس طرح مرکّب لفظ بنانے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہر مفہوم یا اس کے کسی ایک مختلف پہلو کو ظاہر کرنے کے لیے ہمیشہ نئے اور جداگانہ الفاظ کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ محدود ذخیرۂ الفاظ سے ہم زیادہ کام لے سکتے ہیں۔

اپنا امتحان خود لیجیے II

ا۔ جو الفاظ دیئے گئے ہیں، ان کو دیکھیے اور بتائیے کہ ان میں کون کون کھلے لاحقے کے ہیں اور کون بند۔ کھلے لاحقوں میں لفظ جوڑیئے، یہاں تک کہ وہ بند لاحقوں کی منزل تک پہنچ جائیں۔

ب۔ اوپر کے دو حصوں میں جو ملواں یا مرکّب الفاظ آئے ہیں انہیں لکھیے اور بتائیے کہ (I) کن لفظوں کے معنی ان کے ٹکڑوں ہی تک محدود رہے ہیں اور (II) ان لفظوں کے معنی بدلے ہیں اور ان میں تبدیلی ہوئی ہے یا معنی میں پھیلاؤ پیدا ہوا ہے۔

ج۔ ۳-۱-۲ کی عبارت غور سے پڑھیے: اس میں جو مرکّب الفاظ آئے ہیں ان کی فہرست بنایئے اور سابقوں و لاحقوں کی نشاندہی کیجیے:

۲-۷-۱ لاحقوں کا مزید استعمال

اُردو میں استعمال ہونے والے کچھ سابقوں اور لاحقوں کا ذکر پہلے اور دوسرے حصّے میں ہوا۔ آپ کو ان کے استعمالی سے یہ اندازہ ہوا ہوگا کہ

ان کی یا اسی طرح کے دوسرے تعلیقیوں (سابقوں اور لاحقوں) کی مدد سے ہم کس طرح نئے لفظ بنا سکتے ہیں۔ اس طرح نئے بننے والے مرکب الفاظ ہمارے پیچیدہ اور نازک خیالات کو ظاہر کرنے کا ایک اچھا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ اس طرح زبان میں نئے لفظ بنانے یعنی لفظ سازی کا عمل جاری رہتا ہے اور جیسے جیسے ضرورت ہوتی ہے، لفظ کی نئی شکلیں بنتی رہتی ہیں۔ اردو میں بھی اس طرح کے الفاظ کا ایک بڑا سرمایہ اکٹھا ہوگیا ہے۔

اردو الفاظ پر غور کریں تو لفظ بنانے کے دو طریقے عام ہیں۔ ایک تو یہی طریقہ جس کا ذکر اوپر ہوا یعنی تعلیقے (سابقے اور لاحقے) جوڑ کر۔ یہ اردو کا اپنا طریقہ ہے اور زیادہ لفظ سازی اسی طریقے پر ہوتی ہے۔ اردو فعل کا سارا نظام اسی طریقے پر ہے۔ فعل کے سارے زمانے (ماضی، حال، مستقبل) اور سارے صیغے (زمانوں کی ذیلی شکلیں) اسی طریقے پر ہیں مثلاً ایک مادہ فعل ہے 'چل'۔ اس سے دیکھیے کتنی شکلیں بنتی ہیں۔

چلنا۔

چلا ہے، چلا، چلا تھا، چلا گیا، چلا آیا، چلا گیا ہوگا، چلا گیا ہوں گا، چلا گیا تھا، چلا ہوگا، چلا ہوں گا، چل رہا تھا، چل پڑا تھا، چلتا تھا، چلا کرتا تھا، چل دیا تھا۔

اتنی ہی ان کی جمع کی شکلیں اور پھر مونث (واحد+جمع) شکلیں:

چلتا ہے، چل رہا ہے، چلتا رہتا ہے، چل رہا ہوگا۔

اتنی ہی ان کی جمع مذکر کی شکلیں اور پھر مونث (واحد+جمع) شکلیں:

چلے گا، چلوں گا، چلتا ہے، چل رہا ہے، چلتا رہتا ہے، چل رہا ہوگا۔

اتنی ہی ان کی جمع مذکر کی شکلیں اور پھر مونث (واحد+جمع) شکلیں: چلے گا، چلوں گا۔

اسی طرح ان کی جمع اور مونث (واحد+جمع) شکلیں:

چل کر

چلے، چلیں، چلو، چلوں۔

چلانا۔

اور پھر چلانا سے بھی کم و بیش اتنی ہی صورتیں جتنی اوپر بیان ہوئیں۔

اوپر کی شکلوں میں آپ نے دیکھا کہ 'چل' بنیادی لفظ ہے ۔ اسی میں لاحقے جوڑ کر مختلف زمانے اور صیغے بنا لیے گئے ہیں کسی بھی فعل سے اسی طرح زمانے اور صیغے بنائے جا سکتے ہیں۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ لاحقے کسی بھی مادۂ فعل کے ساتھ جوڑے جا سکتے ہیں۔ دونوں بیانوں کا نتیجہ ایک ہی ہے اور ہم مرکزی لفظ 'چل' میں ایک یا دوسرا لاحقہ جوڑ کر لفظ کی مختلف شکلیں بناتے ہیں۔

لفظوں میں تبدیلیاں

اسی مادۂ 'چل' سے اسم بنتا ہے 'چال'۔ اس میں سابقہ یا لاحقہ نہ جوڑ کر لفظ میں دوسری طرح کی تبدیلی کی گئی ہے اور اس کے لفظ کا ایک نیا پہلو پیدا ہو گیا ہے۔ اردو میں استعمال ہونے والے عربی، فارسی کے بہت سے لفظوں میں اسی طرح تبدیلیاں ہوتی ہیں اور نئے لفظ بن جاتے ہیں۔ آپ تعلیم حاصل کر رہے ہیں اب تعلیم ہی کے آس پاس کے لفظوں کو لیجیے : تعلیم، عالم، عِلم، علما، علوم، پانچ لفظ ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ان میں 'عِلم' کا لفظ مرکزی میں ہے۔ اسی سے دوسرے لفظ بنے ہیں۔ لفظ کی نئی صورت کے معنی کی تبدیلی دیکھیے :

عِلم :

علوم : علم کی جمع

تعلیم : عِلم پہچاننا یا حاصل کرنا (اس میں فعلیت شامل ہو گئی یعنی یہ کام ہو گیا جسے کیا جاتا ہے۔)

عالم : عِلم رکھنے والا (فاعلیت کے معنی پیدا ہوئے یعنی وہ آدمی جو علم حاصل کر چکا ہو)

علما : عالم کی جمع

عِلم، ہی سے بننے والے مندرجہ ذیل الفاظ بھی اردو میں عام استعمال ہوتے ہیں۔

معلّم : تعلیم دینے والا، پڑھانے والا۔

متعلّم : تعلیم حاصل کرنے والا، پڑھنے والا۔

کچھ اور شکلیں لاحقوں/سابقوں کی مدد سے بنائی جاتی ہیں:

معلّمین : معلّم کی جمع ہے۔

متعلّمین : متعلّم کی جمع ہے۔

عالِم، معلّم اور متعلّم تینوں کی اُردو جمع ۔ وں لگا کر بھی بنائی جا سکتی ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سابقوں اور لاحقوں کے جوڑے بغیر کچھ اور تبدیلیاں لفظوں میں ہوتی ہیں اور نئے لفظ بن جاتے ہیں۔ بعض اور لفظوں کی بھی مختلف صورتیں اردو میں استعمال ہوتی ہیں مثلاً :

حکومت : حاکم، حکام، محکوم، حاکمیت، محکومیت، حکم۔

نظام : نظم، انتظام، منتظم، منظم، ناظم۔

خلاف : مخالف، مخالفت، اختلاف، مختلف۔

احترام : محترم، حرمت، حرم

جذبہ : جذب، مجذوب، جذباتیت، جذباتی۔

مشق III

۱۔ لفظوں میں تبدیلیاں پیدا کرنے کے عام طریقے کیا ہیں؟

۲۔ خالی جگہیں بھریئے۔

ــــ	قومی
ادب	ــــ
ایماندار	ــــ
تعلیم	ــــ
عِلم	ــــ
ــــ	بارانی
ــــ	مرکزی
ــــ	باریکی
ــــ	بے طاقتی

۲-۸ لفظ جاندار ہوتے ہیں

لفظوں کے اس کھیل سے شاید آپ اب تک کافی تھک گئے ہوں گے۔ شاید آپ سمجھ رہے ہوں کہ لفظ بھی شطرنج کے مہروں کی طرح ہیں ادھر سے اُدھر رکھتے جائیے اور یہ اپنا کام کرتے جائیں گے یا شاید کسی مشین کے پرزے ہیں کہ بٹن دبایا اور مشین چلنے لگی۔ مگر ذرا ٹھیریئے، آپ نے غور کیا ہے کہ لفظوں میں بھی جان ہوتی ہے اور ایسی جان ہوتی ہے کہ جب چاہیں لوگوں کو گلے ملا دیں، جب چاہیں انہیں ایک دوسرے کا گلا کاٹنے پر مجبور کر دیں اور لوگوں ہی کو کیوں قوموں کو گلے بھی ملا سکتے ہیں اور لڑوا بھی سکتے ہیں۔

کسی عالم سے پوچھا گیا کہ انسان کے جسم میں سب سے اچھا کون سا حصّہ ہے؟ اس نے جواب دیا "زبان، کہ جب چلتی ہے تو منھ سے پھول جھڑتے ہیں"۔ پھر سوال کرنے والے نے اسی دانشمند سے پوچھا کہ سب سے خراب حصّہ کون سا ہے؟ اس نے پھر وہی جواب دیا "زبان، کہ جب چلتی ہے تو اس کے زخم تلوار سے بھی زیادہ گہرے ہوتے ہیں"۔ اور زبان یہ سب کام لفظوں ہی کے ذریعے کرتی ہے۔

یہ تو لفظوں کے زندہ اور طاقتور ہونے کا فقط ایک ہی ثبوت تھا۔ اب دوسرا ثبوت دیکھیے۔ جیسے انسانوں اور جانوروں میں نر اور مادہ ہوتے ہیں اسی طرح کم سے کم اُردو کی حد تک تو لفظوں میں بھی نر اور مادہ ہوتے ہیں۔ انگریزی میں تو کچھ لفظ نر ہوتے ہیں کچھ مادہ اور کچھ بے جان، مگر اُردو میں سبھی لفظ یا تو نر ہوتے ہیں یا مادہ۔ اور اسی اعتبار سے ان کے لیے نر یا مادہ فعل استعمال کیے جاتے ہیں۔

الفاظ ہمارے خیالات کو ظاہر کرتے ہیں۔ وہ ہمارے خیال کی ایسی علامتیں ہیں جنہیں ہم نے خود مقرر کر لیا ہے۔ 'میز' کو 'میز' یا 'گھر' کو 'گھر' کہنا، نہ کسی قانون کی وجہ سے تھا اور نہ کسی دلیل کی وجہ سے بس ان چیزوں کو ہم نے من مانے نام دے دیے اور یہ لفظ ان کی علامت بن گئے۔ ان علامتوں کو استعمال کرنے والے سب لوگوں کے ذہن میں

اب ان سے ایک ہی خیال پیدا ہوتا ہے۔ خیال خود ایک بجلی کی زندہ رو کی طرح ہے اس لیے خود اس کو حرکت میں لانے والی چیز یعنی لفظ کو ہم بے جان نہیں کہہ سکتے۔

۲-۹ لفظ اور جنس۔ مذکر اور مونث

ہم اردو والوں نے لفظوں کو ایک اور طرح بھی زندگی بخش دی ہے۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ تمام جاندار اشیا میں جنس ضرور ہوتی ہے یعنی وہ مذکر (نر) ہوں گی یا مونث (مادہ)۔ مذکر یا مونث ہونا ان کی زندگی کی دلیل ہے۔ اردو اپنے تمام اسما کے ساتھ جنس وابستہ کرتی ہے۔ بے جان چیزوں کے لیے استعمال ہونے والے لفظ بھی مذکر و مونث میں تقسیم ہوتے ہیں اور اس طرح زندگی کو آئینہ دکھاتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ہر لفظ جیتے جاگتے انسانوں ہی کی طرح یا تو الگ تھلگ اور تنہا ہوتا ہے یا پھر دو یا دو سے زیادہ چیزوں یا لوگوں کو ظاہر کرتا ہے۔

گویا اسم کے طور پر استعمال ہونے والا کوئی بھی لفظ کسی چیز کا صرف نام نہیں بتاتا۔ بلکہ اس کی جنس بھی اس میں شامل ہوتی ہے۔ اسی کے ساتھ اس کی تعداد کا تصور بھی اس میں شامل ہوتا ہے۔ یہ کہ یہ ایک چیز (واحد) کے لیے ہے یا ایک سے زیادہ (جمع) کے لیے۔

۲-۱۰ واحد، جمع

اب ذرا ۳-۲ کی عبارت پڑھیں تو آپ دیکھیں گے کہ بہت سے لفظ ایسے ہیں جو آدمی ہیں نہ جانور مگر انھیں نر اور مادہ قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً اکائی کو پچھلی کہا گیا ہے پچھلا نہیں کہا گیا (یعنی اکائی مونث ہے مذکر نہیں) اسی طرح زندگی، کام، تعلیم، ضرورت، زبان، خیال، آئینہ، شکل، مطلب غرض درجنوں لفظ ایسے ہیں جنھیں یا تو مونث قرار دیا جاتا ہے یا مذکر یا پھر ان کی تعداد پر غور کیجیے اکائی واحد ہوئی۔ اور طریقے جمع ہو گئے۔ لفظ واحد یعنی ایک ہوا اور لفظوں یا الفاظ جمع ہو گئے (حالانکہ اردو میں لفظ واحد اور جمع دونوں طریقے پر بھی استعمال ہوتا ہے) مثال واحد ہوئی مثالیں

جمع ہوگئیں۔

اس لیے اب جو لفظوں پر نظر ڈالیں یا انہیں بولیں اور لکھیں تو انہیں اپنی طرح جان دار ہی سمجھیں ان سے پوچھ گچھ کر لیں کہ وہ واحد ہیں یا جمع مذکر ہیں یا مونث کیونکہ ان کے واحد یا جمع ہونے یا مذکر یا مونث ہونے سے آپ کے جملے پر اثر پڑے گا اور آپ جو کچھ بولیں گے یا لکھیں گے اسی کے مطابق ہوگا۔

مشق IV

۱۔ واحد کی جمع اور جمع کے واحد لکھیے :

واحد	جمع
طریقہ	ـــــ
ـــــ	الفاظ
ـــــ	ٹکڑے
راستہ	ـــــ
آئینہ	ـــــ

۲۔ لکھیے کہ نیچے لکھے ہوئے لفظوں میں کون مونث ہے اور کون مذکّر ؟

الف۔ آئینہ (مذکر/مونث) ب۔ ضرورت (مذکر/مونث)

ج۔ سردی (مذکر/مونث) د۔ رواج (مذکر/مونث)

ہ۔ زبان (مذکر/مونث) و۔ رائے (مذکر/مونث)

۲-۱۱ جملے میں لفظوں کے رشتے

اب جب لفظ جان دار ٹھہرے اور نر اور مادہ بھی ہو گئے اور ایک یا ایک سے زیادہ بھی مان لیے گئے تو ان کے باہمی رشتے بھی ہوں گے اور ہر لفظ کے دوست اور دشمن بھی ہوں گے۔ مثال کے طور پر واحد ہوگا تو اپنے ساتھ واحد فعل بھی لائے گا کہ اس کی اسی سے نبھے گی مثلاً:

لڑکا ← اسکول ← جا رہا ہے

× جا رہے ہیں

× جا رہی ہے

جا رہی ہیں

'لڑکا' واحد ہے تو فعل بھی واحد ہوگا "جا رہا ہے"، ہی لکھنا ہوگا۔ "جا رہے ہیں"، نہیں لکھ سکتے، لڑکا مذکر ہے تو فعل بھی مذکر ہی لکھنا ہوگا "جا رہا ہے"، ہی لکھنا ہوگا "جا رہی ہے" نہیں لکھ سکتے۔

پھر مسئلہ صرف لفظوں کی ترتیب کا نہیں، بلکہ اور طرح بھی ان کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق رہتا ہے۔ ۳-۲ کی عبارت کے اس جملے کو لیجیے: "دراصل جس طرح اپنا خیال رکھنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی دن رات آئینے کے سامنے بیٹھا اپنی شکل تکتا رہے اسی طرح اپنی زبان یا اپنی مادری زبان سے محبت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسری زبانوں سے نفرت کرنے لگے"۔ اس عبارت میں 'اپنا' کے بجائے 'اپنی'، "کا" کے بجائے "کی" اور "تکتا رہے" کے بجائے "تکتی رہی" کیوں نہیں ہو سکتا؟ وجہ ظاہر ہے 'اپنا' کا تعلق 'خیال' سے ہے جو مذکر ہے، اس لیے 'اپنا' کا مذکر ہونا لازم ہے۔ "کا" کا تعلق "مطلب" سے ہے جو مذکر ہے۔ اس لیے "کا" کی مونث شکل نہیں آسکتی۔ "تکتا رہے" کا تعلق 'آدمی' سے ہے جو مذکر ہے اس لیے اس کو بھی مذکر ہونا چاہیے۔ جملے کے لفظوں کی ظاہری ترتیب کے علاوہ یہ لفظوں کا آپس کا تعلق ہے جو ایک دوسرے پر اثر ڈالتا ہے اور ہر لفظ دوسروں سے بندھا رہتا ہے۔ اس میں جنس، تعداد کے علاوہ زمانہ، فعل کے صیغے وغیرہ کی بہت سی شرطیں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ صحیح جملہ لکھنے کے لیے ان تمام باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

یاد رکھیے صحیح جملے کے لیے جملے میں لفظوں کی صحیح ترتیب اور ان کا ایک دوسرے سے صحیح رشتہ قائم ہونا ضروری ہوتا ہے۔

۲-۱۲ خلاصۂ بحث

اس پوری اکائی پر ایک بار پھر نظر ڈالیے:

اس میں آپ نے اردو زبان کی ایک اور ضروری پہچان سیکھی ہے اور وہ ہے پرانے لفظوں سے سابقوں اور لاحقوں کے ذریعے نئے لفظ بنانے کا طریقہ۔ یہ طریقہ بھی کئی طرز سے برتا جاتا ہے۔ اسمی اور صفتی سابقے

اور لاحقے ہوتے ہیں، کھُلے اور بند بھی ہوتے ہیں۔

آپ نے یہ بھی سیکھا کہ اُردو زبان نے نئے لفظ ڈھالنے کے لیے جو سابقے اور لاحقے کے طریقے اختیار کیے ہیں وہ کچھ سنسکرت سے لیے ہیں۔ مثلاً 'س' یا 'ک' کے سابقے سے نئے لفظ بنانا جیسے: سپوت، کپوت وغیرہ یا "الف" کے سابقے سے اٹل اور کچھ عربی اور فارسی سے لیے ہیں۔ جیسے: بے یا بد کے سابقے سے بے زبان یا بدبُو بنانا۔

آپ نے یہ بھی سیکھا کہ بعض سابقے اور لاحقے کے الگ بھی معنی ہوتے ہیں اور بعض کے اصل لفظ سے الگ کوئی معنی نہیں ہوتے جیسے خوشبو میں 'خوش' کے الگ معنی بھی ہیں، مگر بے معنی میں 'بے' کے الگ معنی نہیں ہیں۔

اسی طرح آپ نے کھُلے اور بند لاحقوں کی پہچان کی۔

آپ نے یہ بھی سیکھا کہ جان داروں کی طرح لفظوں کی جنس بھی ہوتی ہے اور تعداد بھی، وہ مذکر اور مونث بھی ہوتے ہیں اور واحد اور جمع بھی، اور اردو میں بولنے اور لکھنے کا دارو مدار لفظوں کے جنس اور تعداد کے اعتبار سے فعل اور صفت وغیرہ استعمال کرنے پر ہے۔

اُردو کے جملوں کا صحیح ہونا لفظوں کے انہی باہمی رشتوں پر ہے۔

آپ نے سیکھا کہ اردو قواعد اور لفظ سازی کے طریقوں کے اعتبار سے بھی سنسکرت کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی اور ترکی الفاظ سے بھی فائدہ اٹھاتی ہے اور یہ اس کی ایک خاص پہچان ہے۔

جوابات

(۱) بے ایمان، (۲) بے حس، (۳) بے وفا، (۴) بے ادب، (۵) بے سبب۔

اشارہ: "نا" صفت کے ساتھ جوڑا گیا اور صفت ہی باقی رہا۔ مگر پہلے جو صفت موجود تھی وہ "نا" کے اضافے سے معدوم ہوگئی اور اس کی اُلٹی صفت پیدا ہوگئی۔

اشارہ: کنارہ کشی (کھُلا اختتام) + ی = کنارہ کشی (بند اختتام)

۲-۳۲- اشارہ : چلا سے چلی، چلے، چلیں

مشق ۱

۱- اظہار کی نئی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے۔ ۲- سابقہ یا لاحقہ لگا کر
۳- جی ہاں ۴- مکمّل وہ جو اپنے طور پر پورے معنی رکھتا ہو۔ نامکمّل وہ جو کسی دوسرے لفظ سے مل کر معنی دیتا ہو۔
۵- کسی مرکزی لفظ سے پہلے لگایا جانے والا اضافی لفظ
۶- بے بس، بے کار، بے معنی، بے قاعدہ، بے مثال

مشق ۲

۱- (الف) پیش کار، پیشی، خودداری، خودغرضی، خوش باش، خوش آواز، سرفراز، سرفروش، سربراہ، یک رنگ، یک جائی، یک جہتی۔

(ب) با

بر- برباد- بربادی۔
ت- تماہی- تکونا
ک- کپوت- سکھی
س- سگندھ- سپوت
ہم- ہم خیال، ہم جماعت
ان- ان دیکھی- ان کہی

۲- خوش، بد، خود، سر، یک
۳- ب، ک، س، ا، بر

اپنا امتحان خود لیجیے :

۱- (الف) ۲- ی- وارانہ، ی، ی، ی، ی، ی، ی، ی، ی، ی
۳- کش، دہ، وار، دار، بر۔ ۴- جس میں اصل لفظ اسم ہو اور لاحقہ لگانے کے بعد بھی اسم رہے۔ ۵- سرکاری، مُلکی، قومی

مشق ۳ : سابقے اور لاحقے لگا کر ب- قوم، ادبی، ایمانداری، تعلیمی، علمی، باراں، مرکز، باریک، بے طاقت

مشق ۴ : ۱- طریقے، لفظ، ٹکڑا، راستے، آئینے۔ ۲- (الف) اور (د) مذکر ہیں باقی سب مؤنث ہیں۔

جوابات :

اکائی ۳ : مترادف اور متضاد الفاظ

ترتیب :

۳-۰ مقصد

۳-۱ دیباچہ

۳-۲ متن کا پہلا حصہ

۳-۳ متن پر گفتگو

۳-۴ مترادفات

مشق I

۳-۵ دوسرا متن

۳-۶ دوسرے متن پر گفتگو

۳-۷ متضاد الفاظ

اپنا امتحان خود لیجیے I

۳-۸ لفظوں کے جوڑ

۳-۹ کچھ دوسرے جوڑ

۳-۱۰ اضافت

۳-۱۱ تشبیہ

مشق II

۳-۱۲ تیسرا متن

۳-۱۳ تیسرے متن پر گفتگو

۳-۱۴ تیسرے متن کے بارے میں کچھ اور باتیں : ضرب المثل اور محاورے

اپنا امتحان خود لیجیے II

۳-۱۵ خلاصۂ بحث

مزید مطالعے کے لیے

جوابات

۳-۰ مقصد

۱۔ اردو زبان میں اپنی بات اچھی طرح ادا کرنے کی لیاقت پیدا کرنا۔
۲۔ ایک ہی مفہوم کی باریکیوں کو ادا کرنے والے لفظوں کی جان کاری دینا اور
۳۔ ان کے مخالف الفاظ سے واقفیت پیدا کر کے آپ کو زبان و بیان پر بہتر قدرت حاصل کرانا ہی اس باب کا مقصد ہے۔
۴۔ لفظوں کے جُڑنے سے جو نئی صورتیں پیدا ہوتی ہیں ان کے بارے میں آپ کو معلومات فراہم کرنا۔
۵۔ محاورے اور ضرب الامثال کی مدد سے زبان سے بہتر واقفیت اور زبان و ادب کا بہتر استعمال سکھانے میں مدد کرنا اس اکائی کا مقصد ہے کہ آپ خود بھی ان محاوروں کو اپنی تقریر و تحریر میں برتیں۔

۳-۱ دیباچہ

اکائی ۲ میں آپ نے لفظوں کے بننے کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کی تھیں لیکن لفظوں کی بناوٹ ہی تو سب کچھ نہیں ہے۔ اصل تو ان کا استعمال ہے۔ کبھی کئی لفظ ایک ہی طرح کی بات کہتے ہیں، کبھی دو لفظ ایک دوسرے کے مخالف بن کر سامنے آتے ہیں، کبھی وہ ایک دوسرے کے ساتھ جُڑ جاتے ہیں اور نئے نئے معنی پیدا کرتے ہیں۔ اس سے ہمیں خیال کو ادا کرنے میں مدد ملتی ہے تو آیئے لفظوں کی دنیا کے ان گوشوں کی سیر کریں۔

۳-۲ متن کا پہلا حصّہ

آیئے ذرا لفظوں کے برتنے کا انداز کسی مشہور لکھنے والے کی زبان سے سیکھیں:
اُردو کے مشہور ناول نگار نذیر احمد نے دہلی میں ہیضے سے پیدا ہونے والی ویرانی اور پریشانی کا ذکر اس طرح کیا ہے:

"اب سے دُور ایک سال دہلی میں ہیضے کا اتنا زور ہوا کہ ایک حکیم بقا کے کوچے سے ہر روز تیس تیس چالیس چالیس آدمی چھجنے لگے۔ ایک بازارِ میّت تو الدّتہ گرم تھا، ورنہ جدھر جاؤ سناٹا اور ویرانی جس طرف نگاہ کرو

وحشت و پریشانی۔ جن بازاروں میں آدمی کا آدھی رات تک کھوے سے کھوا چھلتا تھا، ایسے اُجڑے پڑے تھے کہ دن دوپہر جاتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا تھا۔ کٹوروں کی جھنکار موقوف، سودے والوں کی پکار بند، ملنا جلنا اختلاط و ملاقات، آمد و شد، بیمار پرسی و عیادت، بازدید و زیارت، مہمانداری و ضیافت، کل رسمیں لوگوں نے اُٹھا دیں۔ ہر شخص اپنی حالت میں مبتلا، مصیبت میں گرفتار، زندگی سے مایوس، کہنے کو زندہ پر مُردے سے بدتر، دل میں ہمت نہ ہاتھ پاؤں میں سکت۔ یا تو گھر میں الٹوانٹی کھٹوائی لے کر پڑ رہا یا کسی بیمار کی تیمارداری کی، یا کسی یار آشنا کا مرنا یاد کر کے کچھ رو پیٹ لیا۔" (توبۃ النصوح)

۳-۳ متن پر گفتگو

مندرجہ بالا پارا آپ نے پڑھا۔ اس میں مصنف نے دلّی میں ہیضے سے پھیلنے والی تباہی کا ذکر کیا ہے۔ یہ تباہی کوئی معمولی تباہی نہ تھی۔ ایک ایک محلّے میں روز تیس تیس چالیس چالیس آدمی مرنے لگیں تو تباہی کا کیا ٹھکانا! مگر مصنف صرف تعداد بتا کر بات ختم نہیں کرتا۔ اس لیے کہ تعداد اگرچہ اہم ہے مگر اس سے بھی زیادہ اہم تو دہشت و ویرانی کے اثرات ہیں۔ جو ہر طرف پھیلتے جا رہے ہیں۔ وہ ان میں سے ایک ایک کو بیان کرتا ہے۔

دہشت کے لیے: ۱۔ بازاروں میں ــــ دن دوپہر جاتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا تھا!

۲۔ مصیبت میں گرفتار؛

۳۔ زندگی سے مایوس

۴۔ کہنے کو زندہ، پر مُردے سے بدتر

۵۔ دل میں ہمت نہ ہاتھ پاؤں میں سکت

ویرانی کے لیے: ۱۔ بازار ــــ اُجڑے پڑے تھے

۲۔ کٹوروں کی جھنکار موقوف

۳۔ سودے والوں کی پکار بند

۴۔ ملنا جلنا ــــ کل رسمیں لوگوں نے اُٹھا دیں

۵۔ گھر میں الٹوانٹی کھٹوائی لے کر پڑ رہا

آپ نے دیکھا، دہشت کی کیفیت بیان کرنے کے لیے کم از کم پانچ باتیں بیان کی گئی ہیں اور اسی طرح ویرانی کی کیفیت بیان کرنے کے لیے بھی۔ گویا ان پانچ باتوں کے معنی بھی

وہی ہیں جو ایک لفظ دہشت اور ویرانی کے ہو سکتے ہیں۔ ذرا غور تو کیجیے ایسا کیوں کیا گیا۔ کیا یہ محض لفّاظی ہے؟ کیا یہ لفظوں کا بے جا استعمال اور ان کا فضول صرف کرنا ہے؟ نہیں۔ بلکہ مصنّف ان حالات کی مکمّل تصویر کھینچنا اور ان کیفیتوں کو زیادہ پُر اثر بنانا چاہتا ہے تاکہ پڑھنے والوں کو اس دہشت اور ویرانی کا پورا احساس ہو سکے۔ ایک ہی بات کو مختلف انداز میں کہنے کا یہ عمل لفظوں میں بھی ہوتا ہے۔ اسی پارے میں مندرجہ ذیل لفظوں کو دیکھیے :

سنّاٹا	اور	ویرانی
وحشت	اور	پریشانی
بیمار پُرسی	اور	عیادت

۳-۴ مترادفات

کبھی کبھی لفظ تقریباً ایک ہی معنی رکھتے ہیں۔ لغت میں ان میں سے کسی ایک لفظ کے معنی دیکھیے تو دوسرا لفظ دیا ہوا ہوگا۔ ایسے لفظوں کو اصطلاح میں مترادف کہا جاتا ہے ــــ یعنی سنّاٹا اور ویرانی ایک دوسرے کے مترادف ہیں۔ اسی طرح بیمار پرسی اور عیادت۔ مترادفات (مترادف کی جمع) : مترادف الفاظ کا استعمال ہر زبان میں ہوتا ہے۔ یہ لفظوں کی بے جا بھرمار نہیں، بلکہ لکھنے والا اپنی بات پر زور دینے کے لیے، اس کو واضح کرنے کے لیے، اس کے مختلف پہلوؤں کو سمیٹنے کے لیے مترادفات کا استعمال کرتا ہے۔

مترادف لفظوں کے معنی کبھی بالکل ایک ہوتے ہیں جیسے اوپر کے لفظوں میں بیمار پرسی اور عیادت۔

ایسے چند الفاظ اور دیکھیے :

دن، روز، یوم

رات، شب، لیل

صادق، سچّا

کاذب، جھوٹا

درست، ٹھیک، صحیح

ڈر، خوف

گناہ، معصیت، پاپ
عبادت، پرستش، پوجا
بڑا، کبیر، عظیم، بزرگ
خوشی، مسرّت

دوسری قسم ان لفظوں کی ہو سکتی ہے جو بالکل یک معنی نہیں رکھتے، بلکہ ان کے معنی ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ جیسے اوپر کے لفظوں میں:

سناٹا اور ویرانی
وحشت اور پریشانی

ایسے چند الفاظ اور دیکھیے:

مہربانی، کرم، عنایت، شفقت
خوشی، انبساط، شادمانی، طرب، مسرت، نشاط، بشاشت
ولولہ، جوش
عقل، دانش، ہوش، دانائی
خدشہ، ڈر، خطرہ، دبدبہ
آفت، مصیبت، پریشانی

لیکن یہ بات یاد رکھیے کہ مترادفات خواہ پہلی قسم کے ہوں یا دوسری قسم کے، زبان میں ان کا استعمال بہت عام ہوتا ہے۔ جس زبان میں جتنے مترادفات ہیں وہ اتنی ہی مالدار ہے اور جس اہلِ قلم کی دسترس زیادہ سے زیادہ مترادفات تک ہو وہ اپنے خیالات کو زیادہ آسانی اور وضاحت سے اور مؤثر انداز میں بیان کر سکتا ہے۔ وہ اس بیان میں رنگا رنگی پیدا کر کے دل کشی پیدا کر سکتا ہے۔ انیس نے جب یہ کہا تھا ع اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں، تو ایک طرح سے یہ بھی زبان دانی کا ہی دعویٰ تھا اور اس میں یہ بات بھی شامل تھی کہ ان کو الفاظ پر بے پناہ قدرت حاصل تھی۔ آپ اپنی کتاب میں بہت سے مترادفات پڑھیں گے۔ ذیل میں کچھ مترادفات دیے جا رہے ہیں:

اُمید، رجا
یاس، نا اُمیدی
غم، رنج، الم، افسوس

تعظیم، عزّت، تکریم
ظلم، ستم، زیادتی
قدر، عزّت، منزلت
وعدہ، عہد، پیماں
شان، شوکت، شکوہ
صحت مند، تندرست
دانا، عقل مند، دانش مند

مشق I

۱۔ مترادفات سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟ (۲۰ الفاظ)

۲۔ مترادفات کے استعمال کا کیا فائدہ ہے؟ چار جملوں میں لکھیے (۲۰ الفاظ)

۳۔ مندرجہ ذیل جدول کے پہلے اور تیسرے کالم میں کچھ لفظ لکھے گئے ہیں۔ تیسرے کالم کے لفظوں کی ترتیب بدل کر دوسرے کالم میں اس طرح لکھیے کہ پہلے اور دوسرے کالم کے آمنے سامنے کے لفظ مترادف ہوں۔

۱	۲	۳
شور		غم
ظلم		عیش
رواج		غُل
تغیر		تعظیم
عشرت		ستم
الم		رسم
تکریم		تبدّل

۳-۵ دوسرا متن

اب ایک اور مشہور لکھنے والے سے لفظوں کا استعمال سیکھیے اور دیکھیے وہ لفظوں کو کس طرح برتتے ہیں :

اردو کے صاحبِ طرز مصنف محمد حسین آزاد کا ایک اقتباس پڑھیے :

"ظرافتِ اصلی اور ظرافتِ نقلی میں اتنا ہی فرق ہے جتنا آدمی اور بندر میں۔ سب سے پہلے تو یہ ہے کہ اُسے بندر کی طرح جھوٹ موٹ کی دغابازیاں اور ویسے ہی نقلیں کرنے کی عادت ہے۔ دوسرے اس قسم کے کام کرکے نہایت خوش ہوتا ہے بلکہ دونوں باتیں اُسے یکساں ہیں۔ خواہ خلعت پہنا دے، خواہ رُسوا کر دے۔ ابھی ایک شخص کو باعظمت و احترام بنا دے، ابھی چٹکیوں میں اُڑا دے۔ کسی کی نافہمی اور بدعقلی دکھا دے، کسی کی دانش و دانائی سُنا دے۔ ابھی دولت و نعمت کی مسند پر بٹھا دے، ابھی کنگال فقیر بنا دے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ جھوٹ کی تھیلی ہر وقت بھری ہے، کبھی خالی نہیں ہوتی۔ تیسرے ایسا کمبخت ہے کہ جو ہاتھ اُسے رزق دیتا ہے، اُسی کو کاٹ کھاتا ہے اور دوست و دشمن دونوں کی برابر خاک اُڑاتا ہے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ انسانیت سے خارج ہے۔ اس لیے خوش طبعی کیے جاتا ہے، جیسی ہو سکے اور جہاں ہو سکے نہ یہ کہ جیسی ہونی چاہیے اور جہاں ہونی چاہیے۔ چوتھے چونکہ عقل سے بالکل محروم ہے اس واسطے اخلاق یا صلاحیت کی نصیحت پر ذرا کان نہیں دھرتا۔ پانچویں چونکہ ہنسی چہل کے سوا اور کسی قابل نہیں اور ہر شخص پر فوقیت کی ہوس رکھتا ہے، اس لیے اس کا تمسخر ہمیشہ ذاتی ہوتا ہے۔"

(محمد حسین آزاد، نیرنگِ خیال، حصہ دوم)

۳-۶ دوسرے متن پر گفتگو

زندگی یک رنگ نہیں ہے۔ اس میں انسان طرح طرح کی حالتوں اور کیفیتوں سے دوچار ہوتا ہے۔ مگر ان حالتوں کو الگ الگ اسی لیے پہچانا جاتا ہے کہ ہر ایک

کی مخالف حالت موجود ہے۔ سفید کو ہم اسی لیے پہچانتے ہیں کہ سیاہی بھی موجود ہے۔ دن کو رات سے اور بڑے کو چھوٹے سے ہی پہچانا جاتا ہے۔ اوپر کے بارے میں:

اصلی	:	نقلی
نافہمی	:	دانش
بدعقلی	:	دانائی
بھری	:	خالی
دوست	:	دشمن

ایک دوسرے کے خلاف معنی ظاہر کرتے ہیں۔ اس طرح کا تضاد، کیفیت، حالت، سمت، وقت، فعل، اشیا اور ان کی جنس اور انسانی رشتوں میں نظر آتا ہے۔ اس تضاد کو ظاہر کرنے والے الفاظ کو "متضاد الفاظ" کہا جاتا ہے۔

متضاد الفاظ کبھی اپنا بالکل الگ الگ روپ رکھتے ہیں اور کبھی لفظ کے اندر ہی کوئی تبدیلی کر کے تضاد پیدا کر لیا جاتا ہے۔ مثلاً جنس کا تضاد ظاہر کرنے والے مندرجہ ذیل گروہوں کے لفظوں کو دیکھیے:

لڑکا	:	لڑکی	۲۔ مرد	:	عورت
بیٹا	:	بیٹی	باپ	:	ماں
بھینسا	:	بھینس	شوہر	:	بیوی
ہاتھی	:	ہتھنی	بَیل	:	گائے
کُتّا	:	کُتیا			

رشتوں کا تضاد ظاہر کرنے والے بعض متضاد الفاظ:

باپ	:	بیٹا	آقا	:	نوکر
ماں	:	بیٹی	اُستاد	:	شاگرد
بھائی	:	بہن	دوست	:	دشمن
آزاد	:	غلام			
بادشاہ	:	رعیت			

سمتوں کو ظاہر کرنے والے چند متضاد الفاظ:

آگے	:	پیچھے	مشرق	:	مغرب
اوپر	:	نیچے	اِدھر	:	اُدھر

دایاں : بایاں اندر : باہر

فعل کا تضاد ظاہر کرنے والے کچھ الفاظ :

چڑھنا	:	اُترنا	جاگنا	:	سونا
آنا	:	جانا	جوڑنا	:	توڑنا
چلنا	:	رُکنا	ہنسنا	:	رونا

متضاد کیفیتوں کو ظاہر کرنے والے الفاظ :

نیکی	:	بدی	اُمید	:	یاس
محبّت	:	نفرت	کثرت	:	قلّت
اقرار	:	انکار	رحم	:	غضب
فتح	:	شکست	آزادی	:	غلامی

صفت ظاہر کرنے والے بعض متضاد الفاظ :

نرم	:	سخت	شریف	:	رذیل
بڑا	:	چھوٹا	ارزاں	:	گراں
پرانا	:	نیا	عیاں	:	نہاں
امیر	:	غریب	سچّا	:	جھوٹا
سرد	:	گرم	اعلیٰ	:	ادنیٰ

۳-۷ متضاد الفاظ

بعض موقعوں پر متضاد الفاظ ساتھ ساتھ استعمال کیے جاتے ہیں چونکہ متضاد الفاظ دو انتہاؤں کو ظاہر کرتے ہیں، اس لیے اس صورت میں نہ صرف اس خاص حالت یا کیفیت یا شے کی نمائندگی کرتے ہیں بلکہ درمیانی تمام اشیا کا بھی احاطہ کر لیتے ہیں اور یوں وسیع تر معنی کے اظہار کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

"دوست و دشمن دونوں کی برابر خاک اُڑاتا ہے" (۳-۵) یہاں 'دوست و دشمن' کا مطلب ہے 'ہر شخص خواہ اس سے کیسا ہی تعلّق کیوں نہ ہو'۔

اوّل و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا
نقشِ کہن ہو کہ نو منزل آخر فنا

اس شعر میں اوّل و آخر، باطن و ظاہر، کہن۔ نو متضاد الفاظ کے تین جوڑے استعمال

ہوتے ہیں۔ یہاں اوّل و آخر کا مطلب ہے اوّل شے (حالت) سے لے کر آخر شے (حالت) تک اور ان کے درمیان بھی جو کچھ ہے۔

اس جملے میں "شب و روز کی محنت نے اُسے تھکا دیا"، 'شب و روز' کا مطلب ہے ہر وقت؛ ایسے ہی متضاد الفاظ کے چند جوڑے اور دیکھیے:

بحر و بر	دیر و حرم
رزم و بزم	دین و دنیا
لیل و نہار	نیک و بد
آمد و رفت	کم و بیش
آمد و خرچ	خرید و فروخت
رنج و راحت	نشیب و فراز

اپنا امتحان خود لیجیے I

۱۔ اپنی کتاب سے متضاد الفاظ کے پانچ جوڑے تلاش کر کے لکھیے:

_____ _____ _____

_____ _____

۲۔ نیچے کی جدول کے پہلے اور تیسرے کالم میں لفظ لکھے ہیں۔ تیسرے کالم سے لفظ لے کر دوسرے کالم میں اس ترتیب سے لکھیے کہ متضاد لفظوں کا جوڑا بن جائے۔

۱	۲	۳
غلط		آج
صبح		جاہل
اقرار		صحیح
عالم		انکار
کل		شام

۳-۸ لفظوں کے جوڑ

عام بول چال میں اور لکھنے میں بھی ہم لفظوں کا استعمال کرتے ہیں، مگر یہ لفظ الگ الگ ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ اس تعلق کی بنا پر کبھی لفظ اس طرح ترتیب پاتے ہیں کہ ان سے بات پوری ہو جاتی ہے، اسے 'جملہ' کہتے ہیں۔ جیسے :

"مہمان داری وضیافت کی کل رسمیں لوگوں نے اٹھا دیں"۔ (۱۰-۴)

کبھی لفظ ایک دوسرے سے جڑے تو ہوتے ہیں مگر بات پوری نہیں کرتے۔ اس طرح کے ٹکڑوں کو 'ترکیب' کہتے ہیں۔ جیسے اسی جملے میں :

۱۔ مہمان داری وضیافت

۲۔ کل رسمیں

ان میں اگرچہ مہمان داری اور ضیافت بالکل الگ الگ لفظ ہیں اور ان میں سے ہر ایک آزادانہ طور پر استعمال ہوتا ہے، لیکن یہاں دونوں مل کر استعمال ہوئے ہیں۔ یہ مترادف الفاظ ہیں، لیکن اس طرح جڑنے والے لفظوں کا مترادف ہی ہونا ضروری نہیں ہے۔ جیسے :

۳۔ آمد و شد

۴۔ دوست دشمن

۵۔ ظرافتِ اصلی اور ظرافتِ نقلی

ان ترکیبوں میں لفظوں کو جوڑنے کے لیے 'و' اور 'اور' کا استعمال کیا گیا ہے۔ انہیں مرکبِ عطفی کہتے ہیں۔ اوپر کی مثالوں میں سے (۱) میں بھی 'و' کا استعمال ہوا ہے۔ یہاں دوسرا لفظ پہلے لفظ پر کچھ اضافہ کرتا ہے، خواہ وہ مثبت سمت میں ہو یعنی مترادف لفظ کے ساتھ یا منفی سمت میں یعنی متضاد لفظ کے ساتھ، لکھنے والا اپنی بات کو زیادہ مؤثر بنا کر پیش کرنا چاہتا ہے۔ یوں ترکیب بنانے کا یہ انداز بہت عام ہے۔ لیکن پھر بھی مرکبِ عطفی کی کچھ مثالیں نیچے دی جا رہی ہیں۔ آپ ان کو ذہن میں رکھ کر اپنے الفاظ کے ذخیرے کو بڑھا سکتے ہیں اور انہیں استعمال کریں :

عیش و عشرت	قول و فعل	صنعت و حرفت
جد و جہد	دین و دنیا	آب و ہوا
غور و فکر	مکر و فریب	رسم و رواج
خط و کتابت	خواب و خیال	رنگ و بُو
جنگ و جدل	نظم و نثر	سرخ و سفید
نیست و نابود	شیر و شکر	تحریر و تقریر

۳-۹ کچھ دوسرے جوڑ

ان مثالوں میں کچھ لفظ ایک دوسرے کے ساتھ 'و' کے ذریعے جُڑے ہوئے ہیں۔ لیکن مثال (۲) میں جوڑنے والا لفظ کوئی نہیں ہے۔ پھر بھی دونوں لفظوں کا گہرا تعلق ہے۔ دوسرا لفظ اگر اسم (کسی چیز کا نام) ہے تو پہلا اس کی کوئی صفت بتاتا ہے۔ پہلے لفظ کو صفت اور دوسرے کو موصوف کہتے ہیں، یعنی 'کُل' صفت ہے اور 'رسمیں' موصوف اور دونوں لفظ مل کر مرکّبِ توصیفی کہلاتے ہیں۔ اُردو میں اس کی کئی صورتیں استعمال ہوتی ہیں۔ سب سے سادہ صورت مذکورہ مثال میں ہے، جہاں پہلے صفت اور پھر موصوف رکھ کر 'مرکّبِ توصیفی' بن جاتا ہے ؎

کیا سماں اس بہار کا ہو بیاں ہر طرف صاف ندیاں تھیں رواں
تھے اناروں کے بے شمار درخت اور پیپل کے سایہ دار درخت

صاف ندیاں، بے شمار درخت، سایہ دار درخت یہ سب مرکّبِ توصیفی ہیں۔

۷-۳ میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ دو لفظ 'و'، یا 'اور' کے ذریعے جُڑ جاتے ہیں۔ اسی طرح کا لفظ 'کا' (کی، کے) بھی ہے جو دو اسموں کے درمیان آ کر ان کو ایک دوسرے سے جوڑ دیتا ہے۔

کٹوروں کی جھنکار	جھوٹ کی تھیلی
سودے والوں کی پکار	اس قسم کے کام

اس جوڑ سے دو اسموں کے درمیان جو تعلق پیدا ہوتا ہے، اسے 'اضافت' کہتے ہیں۔ جس چیز کا تعلق ہوتا ہے اسے 'مضاف' اور جس سے تعلق ہوا ہے، اُسے "مضاف الیہ" کہا جاتا ہے۔ ان مثالوں میں 'جھنکار'، 'پکار'، 'تھیلی'، 'کام' مضاف

ہیں اور 'کٹوروں' 'سودوں والوں' جھوٹ' اس قسم "مضاف الیہ۔ ان لفظوں کے اس طرح ملنے سے جو ترکیب بنتی ہے اسے "مرکبِ اضافی" کہتے ہیں۔ اضافت 'کا' (کی، کے) استعمال ہونے کی صورت میں عام طور پر 'مضاف الیہ' پہلے 'مضاف' بعد میں آتا ہے۔ اوپر کی مثالوں میں آپ یہ بات دیکھ سکتے ہیں، لیکن کبھی کبھی یہ ترتیب بدل جاتی ہے۔ ؎

کیا بھروسا ہے زندگانی کا
آدمی بُلبُلا ہے پانی کا

'بھروسا زندگانی کا' ← زندگانی کا بھروسا؛ 'بُلبُلا پانی کا' ← پانی کا بُلبُلا

عام طور پر یہ تبدیلی نظم میں ہوتی ہے، جہاں شعر کے وزن کو برقرار رکھنے کے لیے لفظوں کو کچھ آگے پیچھے کرنا پڑتا ہے، لیکن نثر میں بھی اس استعمال پر کوئی پابندی نہیں، بلکہ اس سے بات میں زور پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً سبب اس کا یہ ہے' کہنا اس کا سبب یہ ہے' کہنے کے مقابلے میں زیادہ زور رکھتا ہے۔

۳ - ۱۰ اضافت

اس اضافت سے جو تعلق پیدا ہوتا ہے' وہ کبھی ایک چیز کی دوسری پر ملکیت ظاہر کرتا ہے، جیسے: لڑکے کا قلم' اس میں لڑکا مالک ہے اور 'قلم' اس کی ملکیت ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اور بھی کئی طرح کے تعلق اضافت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ جیسے: 'کٹوروں کی جھنکار'؛ 'سودے والوں کی پکار' میں 'کی' سے جھنکار اور پکار کی خصوصیت معلوم ہوتی ہے۔

اضافت کا یہ تعلق کبھی 'کا' (کی، کے) کے بجائے صرف زیر (ـِـ) سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ جیسے بازارِ مَوت (= مَوت کا بازار) اس صورت میں مضاف پہلے آتا ہے۔ اور مضاف الیہ بعد میں۔ یہاں 'بازار' مضاف ہے اور 'موت' مضاف الیہ۔

ہے مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا — روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا
کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجیے — ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو یہ بھی نہ ہوا
یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا — اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ان اشعار میں 'غمِ فرقت' (= فرقت کا غم)؛ محرومیِ قسمت (= قسمت کی محرومی) وصالِ یار (= یار کا وصال) اسی طرح کی اضافت کی مثالیں ہیں۔

اگرچہ اضافت دو اسموں کو جوڑنے کے کام آتی ہے، لیکن کبھی صفت اور موصوف کے درمیان بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔ یہاں اضافت (ـــِـــ) کے معنی "کا" نہیں ہوتے اور اس اضافت سے مرکب اضافی بننے کے بجائے 'مرکبِ توصیفی' بنتا ہے۔ مرکب توصیفی میں آپ دیکھ چکے ہیں (۸-۳-۱) کہ صفت پہلے آتی ہے اور موصوف بعد میں۔ لیکن اضافت کے استعمال سے یہ ترتیب بدل جاتی ہے۔ جیسے :

ظرافتِ اصلی
ظرافتِ نقلی

ے دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے آخر اس درد کی دوا کیا ہے (دلِ ناداں)

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے (تہذیبِ حاضر)

ع دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی (صبحِ روشن)

ع جدا پارے سے ہو سکتی نہیں تقدیر سیمابی (تقدیرِ سیمابی)

ان سب مرکبات میں دوسرا لفظ صفت ہے اور پہلا موصوف۔ اگر اضافت کا زیر (ـــِـــ) ہٹا دیا جائے تو صفت کو پہلے لانا ہوگا۔

زیر کے استعمال سے ایک لفظ (کا) کم ہو جاتا ہے اور اس طرح لکھنے میں لفظی کفایت کا فائدہ ہوتا ہے۔

یہ زیر کبھی ہمزہ (ء) کی شکل میں بدل دیا جاتا ہے جیسے :

ع مشہور تو جہاں میں ہے دیوانۂ حجاز

وہ بھی دن تھے کہ یہی مایۂ رعنائی تھا نازشِ موسمِ گل لالۂ صحرائی تھا

یہاں 'دیوانۂ حجاز'، 'مایۂ رعنائی'، اور 'لالۂ صحرائی' مرکب اضافی ہیں اور 'دیوانہ'، 'مایہ'، 'لالہ' کی ہمزہ (ء) اضافت کے لیے ہے۔

۳-۱۱ تشبیہ

جب کسی مشترک صفت کی بنا پر ایک چیز کو دوسری کے مانند بتایا جاتا ہے تو اُسے تشبیہ کہتے ہیں۔ جیسے :

حامد شیر جیسا بہادر ہے۔

یہاں بہادری کی صفت حامد اور شیر میں مشترک ہے اور ان دونوں میں تشبیہ کا رشتہ

ہے۔ کبھی اضافت بھی تشبیہ کا کام دیتی ہے۔

ع طبعِ آزاد پہ قیدِ رمضاں بھاری ہے (قیدِ رمضاں = رمضان جو قید کی طرح ہے)

ع نغمۂ اُمید تیری بربطِ دل میں نہیں (بربطِ دل = دل جو بربط کی طرح ہے)

ع شمعِ حق سے جو منوّر ہو یہ وہ محفل نہ تھی (شمعِ حق = حق جو شمع کی طرح ہے)

مشق II

۱۔ مندرجہ ذیل اشعار کو پڑھیے اور بتائیے خط کشیدہ الفاظ کس طرح کی ترکیبیں ہیں:

(۱) بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق — عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

(۲) جو ہے پردے میں نہاں چشمِ بینا دیکھ لیتی ہے — زمانے کی طبیعت کا تقاضا دیکھ لیتی ہے

(۳) لگی نہ میری طبیعت ریاضِ جنّت میں — پیا شعور کا جب جامِ آتشیں میں نے

(۴) ع دیا جہاں کو کبھی جامِ آخریں میں نے

(۵) سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے — تیرے صنم کدوں کے بُت ہو گئے پرانے

(۶) اینوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا — جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

(۷) تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا — واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے

(۸) پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے — خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے

۱۲-۳ تیسرا متن

باتوں باتوں میں ہم بہت دُور نکل آئے۔ بات شروع ہوئی تھی نذیر احمد کے ناول کے ایک ٹکڑے سے، آیئے نذیر احمد کے اس ناول "توبۃ النصوح" کی طرف واپس چلیں:

نذیر احمد کے ناول کا ایک ٹکڑا پڑھیے:

"قصّہ کوتاہ کلیم شیخ چلّی کے سے منصوبے سوچتا ہوا اپنے دوست مرزا ظاہر دار بیگ کے مکان پر پہنچا۔ ہر چند ابھی کچھ ایسی بہت رات نہیں گئی تھی لیکن مرزا جیسے بے فکرے، نکمّے کبھی کی لمبی تان کر سو چکے تھے۔ کلیم نے دروازے پر دستک دی تو جواب ندارد۔

کلیم سے اور مرزا سے محفلِ مشاعرہ میں تعارف پیدا ہوا تھا۔ شدہ شدہ مرزا صاحب کلیم کے مکان پر تشریف لانے لگے۔ یہاں تک کہ اب چند روز سے تو دونوں میں ایسی گاڑھی چھننے لگی تھی کہ گویا ایک

جان دو قالب تھے کلیم کو تو مرزا کے مکان پر جانے کا کبھی بھی اتفاق نہیں ہوا تھا، مگر مرزا شام کو تو کبھی کبھی لیکن صبح کو بلاناغہ آتے اور تمام تمام دن کلیم کے پاس رہتے۔ مرزا نے اپنا اصلی حال کلیم پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ کلیم یہی جانتا تھا کہ جمعدار کا تمام ترکہ مرزا کو ملا اور وہ جمعدار کی محلسرا کو مرزا کی محلسرا سمجھتا تھا۔ اسی غلط فہمی میں وہ گھر سے نکلا تو سیدھا جمعدار کی محلسرا کی ڈیوڑھی پر جا موجود ہوا۔"

۳-۱۳ تیسرے متن پر گفتگو

آپ نے دیکھا کہ کس طرح دو یا دو سے زیادہ لفظ مل کر ایک مرکّب بناتے ہیں۔ ان لفظوں کے مجموعی معنی وہی ہوتے ہیں جو الگ الگ الفاظ کے معنی ہیں۔ لیکن کبھی دو یا دو سے زیادہ لفظ مل کر ایسے معنی دیتے ہیں جو لفظوں کے اصل معنی سے مختلف ہوتے ہیں۔ ایسے مرکّب کو محاورہ کہتے ہیں۔ اوپر کے پارے میں "ایسی گاڑھی چھننے لگی تھی" کے معنی ہیں "بہت گہرے تعلّقات ہو گئے تھے۔ بہت زیادہ ربط ضبط ہو گیا تھا"۔ یہ معنی اس ترکیب کے لفظوں کے نہیں ہیں بلکہ اہلِ زبان نے لغت سے ہٹ کر اس ترکیب کے یہی معنی استعمال کرنا شروع کر دیے ہیں۔ ایسے ہی "ایک جان دو قالب تھے" کا مطلب ہے: "نہایت گہرے دوست تھے"۔ یہاں بھی الگ الگ لفظوں کے جو لغوی معنی ہیں ترکیب کے معنی اس سے مختلف ہیں۔ آپ اگر چاہیں کہ ان میں سے ہر لفظ کے معنی لغت میں دیکھ کر کوئی مطلب نکال لیں تو صحیح مفہوم تک نہیں پہنچ سکتے۔ ہر زبان میں اس طرح کے محاورے اس کا قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں۔ ان میں نہ صرف کسی خاص مفہوم کو اچھوتے انداز میں پیش کر دیا جاتا ہے بلکہ اس سماج کی سمجھ بوجھ اور صدیوں کا تجربہ بھی ان محاوروں میں شامل ہوتا ہے۔

۳-۵ میں بھی ایسے ہی بعض محاورے استعمال ہوتے ہیں:

ابھی چٹکیوں میں اُڑا دے = ذلیل اور رُسوا کر دے، حقیر بنا دے

دوست دشمن دونوں کی خاک اُڑاتا ہے = دوست دشمن دونوں کو ذلیل کرتا ہے

نصیحت پر ذرا کان نہیں دھرنا = نصیحت نہیں سُننا۔

آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ جُز ۲-۳ میں بھی ایسے ہی بعض محاورے استعمال ہوئے ہیں۔

اب سے دور = خدا کرے اب ایسے حالات ہم سے دُور رہیں
بازارِ موت گرم تھا = بہت موتیں واقع ہو رہی تھیں۔
(محاورہ: بازار گرم ہونا)
کھوے سے کھوا چھلتا تھا = لوگوں کی بہت بھیڑ رہتی تھی، چہل پہل رہتی تھی
دن دوپہر = دن کے اُجالے میں
کُل رسمیں لوگوں نے اُٹھا دیں = کُل رسمیں ختم کر دیں
گھر میں الوانی کھٹواٹی لے کر پڑ رہا = غم اور مایوسی کے عالم میں بیزار اور مایوس ہو کر گھر میں پڑ گیا۔

۳-۱۴ تیسرے متن کے بارے میں کچھ اور باتیں۔ ضرب المثل اور محاورے

کبھی کبھی اس طرح کے محاوروں کے پیچھے کوئی تاریخی واقعہ بھی ہوتا ہے اور اس سے ہماری تہذیب اور معاشرت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اس واقعے کو ہم بھول چکے ہوتے ہیں۔ لیکن محاورے میں اس کی نشانی باقی رہ جاتی ہے۔ اس طرح کے محاوروں کو "کہاوت" یا "ضرب المثل" کہا جاتا ہے۔ جیسے:

"کلیم شیخ چلّی کے منصوبے سوچتا ہوا اپنے دوست مرزا ظاہر دار بیگ کے مکان پر پہنچا۔"
(۳-۱)

یہاں شیخ چلّی ایک فرضی شخصیت ہے۔ وہ ہمیشہ ناقابلِ عمل اور احمقانہ باتیں سوچا کرتا تھا۔ "شیخ چلّی کے منصوبے سوچنا" کا مطلب ہے "بے بنیاد اور ناقابلِ عمل باتیں سوچنا"

عام طور پر ضرب الامثال (ضرب المثل کی جمع) کا فقرہ جوں کا توں استعمال ہوتا ہے۔ اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جاتی۔

ذیل میں کچھ محاورے اور ضرب الامثال درج ہیں۔ ان کے معنی بھی دیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی ایک ایک جملہ میں ان کا استعمال بھی دکھایا گیا ہے۔

محاورہ	معنی	استعمال
ہاتھوں کے توتے اُڑنا	بھونچکا رہ جانا، حواس باختہ ہو جانا	اپنی معطلی کی خبر سن کر اس کے ہاتھوں کے توتے اُڑ گئے

محاورہ	معنی	استعمال
پانی پانی ہونا	بہت شرمندہ ہونا	وہ نقل کرتے ہوئے پکڑا گیا تو شرم سے پانی پانی ہو گیا
توتے کی سی آنکھیں پھیر لینا	بے وفائی کرنا	آقا کی دولت ختم ہوئی تو ملازموں نے توتے کی سی آنکھیں پھیر لیں۔
اپنا اُلّو سیدھا کرنا	اپنا مطلب نکالنا، اپنی غرض پوری کرنا	غرض مند لوگ اپنا اُلّو سیدھا کر کے الگ ہو گئے۔ اپنے آقا کی رُسوائی کا کچھ خیال نہ کیا۔
پیٹ کا ہلکا ہونا	رازداری کا اہل نہ ہونا	وہ پیٹ کا بہت ہلکا ہے۔ اس سے رازداری کی کوئی اہم بات نہیں کہنی چاہیے۔
بال کی کھال نکالنا	کسی بات پر جرح کر کے اس کی تہہ تک پہنچنا۔	وکیل لوگ عدالت میں بال کی کھال نکالتے ہیں۔
بغلیں بجانا	خوشیاں منانا	اپنے دشمن کی شکست کی خبر سن کر وہ بغلیں بجانے لگے۔
خربوزے سے خربوزہ رنگ پکڑتا ہے	صحبت کا اثر ضرور ہوتا ہے۔	بچّوں کو بری صحبت میں نہ بیٹھنے دو کہ خربوزے سے خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔
لوہے کے چنے چبانا	بہت دُکھ اُٹھانا، نہایت مشکل کام انجام دینا	حکومت چلانا کوئی آسان کام نہیں۔ اس میں لوہے کے چنے چبانے پڑتے ہیں۔
چار چاند لگنا	عزت اور مرتبہ بڑھ جانا، رونق بڑھ جانا	بیٹیوں کی تعلیم کے بعد اس کے خاندان کو چار چاند لگ گئے۔
ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا	اپنی کسی خامی کے لیے دوسروں کو قصوروار ٹھہرانا	اس کی بے ہنگم تقریر کو لوگوں نے نہیں سُنا تو وہ سامعین کو جاہل قرار دینے لگا۔ سچ ہے ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا۔

اپنا امتحان خود لیجیے II

۱۔ ذیل میں محاورے کی کچھ تعریفیں دی جارہی ہیں۔ ان میں سے صحیح تعریف کون سی ہے ؟

الف۔ جس بات کی ہمیں مشق ہوجائے۔

ب۔ الفاظ کا ایسا مجموعہ جس سے حقیقی معنی کے علاوہ کوئی اور معنی لیے جاتے ہیں۔

ج۔ وہ الفاظ جو شاعر استعمال کرتا ہو۔

د۔ الفاظ کا ایسا مجموعہ جسے پرانے لوگوں نے استعمال کیا ہو۔

۲۔ ۱۲-۳۔ ایں دیے ہوئے محاوروں میں سے پانچ کو استعمال کرتے ہوئے جملے بنائیے۔

۳۔ مرکبِ توصیفی اور مرکبِ اضافی کسے کہتے ہیں ؟ (۲۰ الفاظ)

۴۔ اضافت سے کیا مُراد ہے ؟ (۲۰ الفاظ)

۵۔ مترادفات اور متضاد الفاظ سے کیا مُراد ہے ؟ (۲۰ الفاظ)

۳-۱۵ خلاصۂ بحث

اس اکائی کو ختم کرتے ہوئے آپ کو اندازہ ہوا ہوگا کہ لفظوں کا باہمی تعلق بہت گہرا ہے۔ کبھی وہ ایک دوسرے کے بدل کے طور پر استعمال ہوتے ہیں اور اس طرح ایک دوسرے کے مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ مترادفات کبھی ایک دوسرے کے مخالف ہوتے ہیں اور ٹکراتے ہیں (متضاد)۔ کبھی ایک دوسرے سے اضافت یا حرفِ عطف یا کسی دوسرے طریقے (مرکبِ توصیفی یا مرکبِ اضافی) سے مل کر نیا مفہوم دینے لگتے ہیں۔ کبھی کئی لفظ مل کر محاورہ یا ضرب المثل بن جاتے ہیں۔ غرض زبان کو اپنا مطلب ادا کرنے کے لیے لفظوں کو نت نئے رنگوں میں استعمال کرنا پڑتا ہے اور جو کوئی زبان پر قدرت حاصل کرنا چاہے، اُسے لفظوں کے اس نظام پر بھی قدرت حاصل کرنا پڑتی ہے۔

جوابات

مشق I

۳۔ شور ۔ غُل
ظلم ۔ ستم
رواج ۔ رسم
تغیّر ۔ تبدّل
عشرت ۔ عیش
الم ۔ غم
تکریم ۔ تعظیم
غلط ۔ صحیح

اپنا امتحان خود لیجیے: I

صبح ۔ شام
اقرار ۔ انکار
عالم ۔ جاہل
کل ۔ آج

مشق II

آتشِ نمرود ۔ مرکّب اضافی
لبِ بام ۔ مرکّب اضافی
چشمِ بینا ۔ مرکّب توصیفی
زمانے کی طبیعت ۔ مرکّب اضافی
ریاضِ جنّت ۔ مرکّب اضافی (تشبیہی)
جامِ آتشیں ۔ مرکّب توصیفی
جامِ آخریں ۔ مرکّب توصیفی
صنم کدوں کے بُت ۔ مرکّب اضافی
جنگ و جدل ۔ مرکّب عطفی

دیر و حرم - مرکّب عطفی
واعظ کا وعظ - مرکّب اضافی
خاکِ وطن - مرکّب اضافی

اپنا امتحان خود لیجیے II

(ا) ——— (ب)

مزید مطالعے کے لیے :

قواعد اُردو : ڈاکٹر عبدالحق
اردو کیسے لکھیں : رشید حسن خاں
اردو صرف و نحو : ڈاکٹر انصار اللہ

اکائی ۴ : اصنافِ ادب

ترتیب :

۴-۰ مقاصد

۴-۱ دیباچہ

۴-۲ شاعری کی اصناف

۴-۲-۱ غزل

مشق I

اپنا امتحان خود لیجیے I

۴-۲-۲ نظم

۴-۲-۳ قصیدہ

۴-۲-۴ مرثیہ

۴-۲-۵ مثنوی

۴-۲-۶ دیگر اصناف : رباعی، قطعہ

مشق II

اپنا امتحان خود لیجیے II

۴-۳ نثر کی اصناف

۴-۳-۱ ناول، داستان اور

۴-۳-۲ مختصر افسانہ اور ڈراما

۴-۳-۳ انشائیہ

۴-۳-۴ دیگر اصناف

مشق III

اپنا امتحان خود لیجیے III

۴-۴ خلاصۂ بحث

مزید مطالعے کے لیے

جوابات

۴-۰ مقاصد

اس اکائی کا مقصد : (i) نثر اور نظم کی مختلف اصناف کی پہچان کرانا اور (ii) ان میں زبان کے استعمال کی نوعیت کو واضح کرنا ہے۔
تاکہ آپ سمجھ سکیں کہ آپ کس صنف کو پڑھ یا سُن رہے ہیں اور اس کی کیا خصوصیات ہیں۔ ان سے لطف لیں اور انہیں برتیں۔

۴-۱ دیباچہ

زبان بول چال میں بھی برتی جاتی ہے اور لکھنے پڑھنے میں بھی کام آتی ہے۔ ان میں ایک انداز تو روزمرّہ کام چلانے والا ہوتا ہے، دوسرا ادبی انداز ہوتا ہے۔ ادب کو زبان کا سب سے اچھا اور سب سے خوب صورت انداز مانا جاتا ہے کیوں کہ ادب میں بات اس طرح کہی جاتی ہے کہ دل میں بیٹھ جائے اور پوری طرح سمجھ میں آجائے۔
ادب یا تو نثر میں ہوگا یا نظم میں اور ان دونوں کی بہت سی قسمیں ہیں جنہیں اصناف کہتے ہیں۔ اس اکائی میں نثر اور نظم کی انہیں اصناف کی پہچان کرنی ہے۔

۴-۲ شاعری کی اصناف

شاعری کو انسانیت کی مادری زبان کہا گیا ہے۔ شروع شروع میں تو ہر قسم کی باتیں شاعری ہی میں ادا کی جاتی تھیں۔ شاعری وزن میں کی جاتی تھی یعنی اس کے ٹکڑے ایک سے ہوتے تھے۔ اور ان میں ایک خاص قسم کی جھنکار قایم رہتی تھی اس لیے اسے یاد رکھنا آسان ہوتا تھا بعد کو شاعری میں صرف ایسی باتیں بیان کی جانے لگیں جن کا تعلق انسانی جذبات سے ہوتا ہے۔
اس نظر سے دیکھیے تو شاعری کی جو قسمیں سامنے آئیں گی وہ دو طرح کی ہوں گی :
ایک وہ جو ان باتوں کے لحاظ سے کی گئی ہیں جو کسی قسم کی شاعری میں بیان ہوتی ہیں۔
دوسرے وہ جو کسی قسم کی ساخت یعنی اس کے ٹکڑوں کے برابر ہونے یا ایک وزن میں زیادہ ہونے یا کم یا زیادہ ہونے کی بنا پر کی گئی ہے۔

۴-۲-۱ غزل

اردو شاعری میں سب سے مشہور صنف غزل ہے۔

غزل یوں تو عربی کا لفظ ہے جس کے تین معنی بیان کیے جاتے ہیں:

(i) عورتوں سے یا عورتوں کے بارے میں باتیں کرنا

(ii) ہرن کی وہ آواز جو اس کے زخمی ہونے پر نکلتی ہے۔

(iii) بُننا یا کسی لباس کو تیار کرنا۔

غزل پہلے پہل عربی قصیدوں کے شروع کے حصّے کو کہتے تھے، جس میں یا تو جوانی کی باتیں بیان کی جاتی تھیں یا اخلاق اور نصیحت کی۔ عربی سے فارسی میں آئی تو یہ قصیدے سے الگ ہو گئی۔ اور خود ایک صنف بن گئی۔ صوفی شاعروں نے اسے رواج دیا اور اس میں صوفیانہ مضامین نظم ہونے لگے۔

اچھا، اب اگر غزل ایک صنف ہے تو اس کی پہچان ہمارے پہلے بیان کے مطابق کیا کیا ہو گی؟ آپ پہلے پڑھ آئے ہیں (۲-۴) کہ پہچان دو طرح کی ہوتی ہے — ایک نفسِ مضمون کے اعتبار سے یعنی کسی صنف میں بیان ہونے والی باتوں کے لحاظ سے، دوسری ساخت کے لحاظ سے۔

اب اگر غزل کی پہچان نفسِ مضمون کے لحاظ سے کی جائے تو یہ بھی کہا نہیں جا سکتا کہ جب بھی عورتوں سے یا عورتوں کے بارے میں بات کی جائے تو وہ غزل ہو جائے گی۔ ایسا ہوتا تو آپ اپنے دوستوں سے فلم ایکٹرسوں کے بارے میں باتیں کرنے کو بھی غزل کہتے۔ پھر یہ بھی ہے کہ عشقیہ شاعری یا عورتوں کے بارے میں شاعری تو غزل کے علاوہ دوسری اصناف میں بھی کی جا سکتی ہے اور کی جاتی رہی ہے۔

پھر غزل کی نفسِ مضمون کے اعتبار سے کیا پہچان ہوئی۔ غزل واقعات کا بیان نہیں ہے۔ واقعات سے حاصل ہونے والے احساس یا تجربے کا داخلی بیان ہے — غزل دل پر گزری ہوئی کیفیت کا نچوڑ بیان کرتی ہے۔ یہ کیفیات تو ہر قسم کی ہوتی ہیں، لیکن داخلی ہونے کی وجہ سے ان کا رنگ غزل میں ذاتی ہو جاتا ہے۔ یہ ذاتی لہجہ غزل کی ایک پہچان ہے۔ اس میں زیادہ تر عشقیہ، صوفیانہ، اخلاقی اور سیاسی مضامین بیان ہوتے ہیں۔

آیئے اب ساخت کے لحاظ سے غزل کو پہچانیں۔ سب سے پہلے یہ بات

سامنے آئے گی کہ غزل اکثر باتوں کو خاص علامتوں اور اشاروں میں بیان کرتی ہے اور ان علامتوں اور اشاروں سے غزل کی خاص زبان یا لفظیات بن گئی ہے۔ مثلاً گل، بلبل، شمع، پروانہ، زنداں، زنجیر وغیرہ ان علامتوں کے معنی بدلتے رہتے ہیں اور یہ مختلف قسم کی صورتِ حال میں استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ غزل کی یہی خصوصیت ہے، جسے تعمیم کہا جاتا ہے۔

دوسری بات اس کی ساخت کی یہ ہے کہ اس کا ہر شعر اپنی جگہ مکمل ہوتا ہے۔ یعنی پوری بات کو بیان کر دیتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پوری غزل میں ایک ہی کیفیت یا ایک ہی بات بیان کی گئی ہو جس صورت میں اسے غزل مسلسل کہا جائے گا مگر اس میں بھی ہر شعر اپنی جگہ مکمل ضرور ہوگا اور دوسرے شعر کا محتاج نہیں ہوگا۔ نظم میں ایسا نہیں ہوتا۔

غزل کی ساخت کی تیسری اہم پہچان ہے ردیف اور قافیہ۔ ہر شعر کے آخر میں جوں کا توں آنے والا لفظ یا حرف کو ردیف کہا جاتا ہے اور اس سے فوراً آنے والا ایسا لفظ جو جوں کا توں تو ہر شعر میں نہ آئے مگر اس کی جیسی آواز یا جھنکار رکھنے والے لفظ ہر شعر کے آخر والے حصے میں آئیں، قافیہ کہا جاتا ہے جیسے :

کوئی اُمید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

اس شعر میں "نہیں آتی" کے لفظ پوری غزل کے ہر شعر کے آخر میں آئے ہیں لہٰذا انہیں ردیف کہا جائے گا اور یہ ہر شعر میں جوں کے توں آئیں گے۔

ان لفظوں سے پہلے 'بر' اور 'نظر' کے لفظ آئے ہیں یہ جوں کے توں نہیں ہیں۔ لیکن ان کی آوازیں ایک سی ہیں اور جھنکار ایک ہے اس لیے انہیں قافیہ کہا جائے گا تو اس غزل کی ردیف ہوئی نہیں آتی، اور قافیہ ہوا 'بر' اور 'نظر'

ہر شعر کے دو ٹکڑے ہوتے ہیں اور ہر ٹکڑے کو مصرع کہتے ہیں۔ جب ان دونوں مصرعوں کی ساخت کے ساتھ ردیف اور قافیہ کا ذکر کریں تو ان تینوں کو 'طرح' کے لفظ سے بھی ظاہر کیا جاتا ہے۔

غزل کی ایک اور پہچان یہ بھی ہے کہ اس کے پہلے شعر کو جس کے دونوں مصرعوں میں ردیف اور قافیہ ہو مطلع کہا جاتا ہے اور آخری شعر میں اگر شاعر

اپنا تخلص لائے تو اسے مقطع کہتے ہیں :

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

یہ غزل کا آخری شعر بھی ہے اور اس میں شاعر نے اپنا شاعرانہ نام بھی نظم کیا ہے، اس لیے اسے مقطع کہا جائے گا۔

ایسے دو لفظ جو ایک سی آوازیں رکھتے ہیں ہم قافیہ کہے جاتے ہیں۔ آپ نے وہ لطیفہ سُنا ہوگا کہ اُردو کے مشہور ادیب مجنوں گورکھپوری بہت دُبلے اور دھان پان تھے اتفاق سے اُردو کے مشہور طنز و مزاح نگار کنہیالال کپور بھی اسی طرح دُبلے تھے۔ احمد شاہ بخاری پطرس کپور صاحب کے اُستاد تھے وہ انہیں مذاق سے مجنوں گورکھپوری کا ہم قافیہ کہا کرتے تھے۔ یعنی ایک جیسے دھان پان۔

مشق I

۱۔ غزل کے کیا معنی ہیں ؟
۲۔ غزل میں عام طور پر کس قسم کے مضامین بیان کیے جاتے ہیں ؟
۳۔ داخلی لہجے سے کیا مراد ہے ؟
۴۔ غزل کی ساخت کی بنیادی پہچان بیان کیجیے
۵۔ غزل کی دس بنیادی لفظیات اور علامتیں بیان کیجیے۔
۶۔ ردیف اور قافیہ کسے کہتے ہیں ؟

اپنا امتحان خود لیجیے I

۱۔ نیچے دیے ہوئے شعر میں ردیف کیا ہے اور قافیے کون سے ہیں ؟

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ردیف _____

قافیے _____ اور _____

۲۔ نیچے دیے ہوئے شعروں میں ایک مطلع ہے اور ایک مقطع۔ بتائیے کہ مطلع کون سا ہے اور مقطع کون سا ہے ؟

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے — وہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے
چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسدؔ — آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

۳۔ غزل ـــــ سے پیدا ہونے والے ـــــ اور ـــــ کا مخصوص ـــــ کے ذریعے ـــــ بیان ہے :

اوپر دیے ہوئے جملے کو مندرجہ ذیل لفظوں سے پورا کیجیے :

واقعات ، تجربات ، کیفیات

علامتوں داخلی

۴-۲-۲ نظم:

نظم یوں تو کسی چیز کی ترتیب کا نام ہے۔ مختلف ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے ملانا اور کسی ایک لڑی میں پرونا یا ہار میں گوندھنا نظم کہلاتا ہے بعد کو یہ لفظ شاعری ہی کے لیے استعمال ہونے لگا، لیکن اب اس کے معنی پھر بدلے ہیں۔ نظم سے مراد شاعری کی وہ قسم یا صنف ہے جس میں ہر شعر اپنی جگہ مکمل نہیں ہوتا بلکہ سب شعر مل کر کسی ایک واقعے، کیفیت یا تجربے کو بیان کرتے ہیں اور ایک دوسرے پر منحصر ہوتے ہیں۔

نظم مختصر بھی ہو سکتی ہے اور طویل بھی۔ نظم ردیف قافیے کے ساتھ بھی لکھی جا سکتی ہے (پابند) اور اس کے بغیر بھی (آزاد نظم) پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے مصرعے ایک ہی لمبائی کے ہوں مگر ان میں قافیہ ردیف نہ ہو (نظم معریٰ) اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے ٹکڑے چھوٹے بڑے ہوں (آزاد نظم) لیکن ہر صورت میں ضروری ہوگا کہ نظم کا ہر مصرعہ ایک دوسرے سے مل کر بات کو پورا کرتا ہو۔ کوئی شعر اور کوئی مصرعہ بھی اپنے طور پر الگ تھلگ نہ ہو۔

اس اعتبار سے نظم غزل سے مختلف ہے اور اس کے مزاج کو دو لفظوں میں پہچانا جا سکتا ہے تسلسل اور ارتقا۔

تسلسل سے مراد یہ ہے کہ پوری نظم میں ایک ہی بات کہی گئی ہو یا ایک ہی کیفیت بیان کی گئی ہو۔ غزل کی طرح ہر شعر میں الگ الگ باتیں نہ کہی گئی ہوں۔

ارتقا سے یہ مراد ہے کہ ہر مصرعہ اور ہر شعر اس مرکزی خیال یا بنیادی کیفیت کے بیان کو آگے بڑھاتا ہو اور پوری تصویر کا کوئی نہ کوئی اہم ٹکڑا فراہم کرتا ہو۔ مثال کے طور پر غزل کے دو شعروں کا مقابلہ بعد میں دی گئی دو نظموں سے کیجیے۔ آپ کو

اندازہ ہوگا کہ غزل کے دونوں شعر الگ الگ مضمون کے ہیں۔ اور اپنی جگہ مکمل ہیں، لیکن نظموں کا ہر مصرعہ ایک دوسرے سے ملا ہوا ہے اور ایک لڑی میں پرویا ہوا ہے۔
داغ کی غزل کے دو شعر یہ ہیں :

طبیعت کوئی دم میں بھر جائے گی　　چڑھی ہے یہ آندھی اتر جائے گی
رہیں گی دمِ مرگ تک خواہشیں　　طبیعت کوئی آج بھر جائے گی

دونوں شعروں میں دو مختلف اور ایک دوسرے سے بالکل اُلٹی بات بیان کی گئی ہے اور دونوں شعر اپنی جگہ مکمل ہیں۔ ایک دوسرے کے محتاج نہیں ہیں۔
اب مجاز کی ایک نظم پڑھیے۔ عنوان ہے "بربطِ شکستہ" یعنی ٹوٹا ہوا ساز۔

اُس نے جب کہا مجھ سے "گیت ایک سنا دو نا
سرد ہے فضا دل کی آگ تم لگا دو نا"
کیا حسین تیور تھے کیا لطیف لہجہ تھا
آرزو تھی، حسرت تھی، حکم تھا، تقاضا تھا
گنگنا کے مستی میں ساز لے لیا میں نے
چھیڑ ہی دیا آخر نغمۂ وفا میں نے
درد کی صدا نکلی ہر نوائے خستہ سے
آہ کی دھواں نکلا بربطِ شکستہ سے

اس نظم میں ہر مصرعہ دوسرے مصرعہ کا محتاج ہے اور سب مل جل کر کیفیت اور تاثر کو پورا کرتے ہیں۔ اس میں تسلسل بھی ہے یعنی ایک ہی کیفیت کا بیان) اور ارتقا بھی (یعنی ہر مصرعہ بات کو آگے بڑھاتا ہے)۔
اب اختر الایمان کی ایک معریٰ نظم بھی پڑھیے — (عنوان ہے: "تبدیلی")

اس بھرے شہر میں کوئی ایسا نہیں
جو مجھے راہ چلتے کو پہچان لے
اور آواز دے "او بے او سر پھرے"
دونوں اِک دوسرے سے لپٹ کر وہیں
گرد و پیش اور ماحول کو بھول کر
گالیاں دیں، ہنسیں، ہاتھا پائی کریں
پاس کے پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھ کر

گھنٹوں اِک دوسرے کی سنیں اور کہیں
اور اس نیک روحوں کے بازار میں
میری یہ قیمتی بے بہا زندگی
ایک دن کے لیے اپنا رُخ موڑ لے!

آپ نے دیکھا اس نظم میں ہر مصرعہ ایک دوسرے کا محتاج ہے کہ بات اگلے مصرعے کے بغیر پوری نہیں ہوتی۔ نظم کی یہ خصوصیت ہے اور اسی کو ارتقا کہتے ہیں۔

نظم میں داخلی لہجہ بھی ہو سکتا ہے اور بیانیہ بھی۔ اس میں علامتوں کا استعمال بھی کیا جا سکتا ہے اور اس کے بغیر بھی نظم لکھی جا سکتی ہے۔ اسی طرح نظم کے لیے غزل کے سے موضوعات ـــ عشقیہ، صوفیانہ، اخلاقی اور سیاسی کی بھی پابندی ضروری نہیں ہے۔

نظم کا باقاعدہ رواج تو اردو میں ۱۸۷۴ء کے انجمنِ پنجاب لاہور کے مشاعرے سے ہوا۔ جس میں مصرعہ طرح کی جگہ موضوع دیا گیا تھا اور سب اسی موضوع پر نظمیں لکھ کر لائے تھے۔ نظم کی اصطلاح بھی اسی مشاعرے سے رائج ہوئی، لیکن اس سے پہلے بھی ایک موضوع والی شاعری اردو میں موجود تھی۔ اس کی مختلف شکلیں تھیں اور یہ شکلیں زیادہ تر یا تو نفسِ مضمون کے اعتبار سے طے کی گئی تھیں (مثلاً قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی) یا پھر ساخت کے اعتبار سے (مثلاً مسدّس، رباعی، قطعہ وغیرہ) ان میں سے بعض کا حال آگے آئے گا۔

۴-۲-۳ قصیدہ:

قصیدہ اسی قسم کی ایک صنف ہے جس میں شروع سے آخر تک ایک ہی بات کہی جاتی ہے۔ دراصل قصیدہ، قصد سے نکلا ہے اور قصد کے معنی ہیں ارادہ۔ یہ لفظ عربی کا ہے۔ عرب میں شاعری دو قسم کی مانی جاتی ہے۔ ایک الہامی یعنی ایسی جس میں شاعر کے قصد اور ارادے کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ دوسری وہ جو قصد اور ارادے سے کی جائے۔

قصیدہ اسی دوسری قسم کی شاعری ہے جس کا ایک واضح مقصد کسی کی تعریف کرنا ہوتا ہے۔ پورے قصیدے کی ردیف ایک ہی ہوتی ہے وزن اور بحر بھی ایک ہوتے ہیں۔ قافیے بدلتے تو رہتے ہیں، مگر سب ہم آواز ہوتے ہیں۔

شاعر اس انداز سے قصیدہ شروع کرتا ہے کہ پڑھنے اور سُننے والے کو اندازہ نہ ہو کہ یہ قصیدہ کس کی شان میں کہا گیا ہے۔ یعنی موسم کا ذکر یا اخلاقی مضامین یا زمانے کی شکایت یا اسی قسم کا کوئی اور مضمون۔ اس ابتدائی حصّے کو تشبیب کہا جاتا ہے۔ پھر اچانک اس قسم کی باتوں سے شاعر اپنے ممدوح کی تعریف کا کوئی پہلو نکال لیتا ہے۔ اسے **گریز** کہتے ہیں۔ پھر شاعر **مدح** یعنی تعریف کے نئے نئے مضمون پیدا کرتا ہے۔ کبھی **ممدوح** کا سراپا بیان کرتا ہے۔ کبھی اس کی خوبیاں نظم کرتا ہے۔ ممدوح بادشاہ ہو تو اس کے گھوڑے اور تلوار کی تعریف کرتا ہے آخر میں عرضِ مدعا کرتا ہے یعنی جو کچھ مانگنا ہوتا ہے مانگ لیتا ہے اور دعا پر قصیدہ ختم کرتا ہے۔ انہیں قصیدے کے عناصر ترکیبی یا اہم حصّے کہا جاتا ہے۔

قصیدے میں خوب صورتی نئے نئے مضمون پیدا کرنے سے آتی ہے۔ تشبیب یعنی شروع کے حصّے میں اس کی باقی حصوں سے کہیں زیادہ گنجائش ہوتی ہے اور پڑھنے والے کے لیے حیرت اور مسرت کا موقع فراہم کرتا ہے۔ مثلاً غالب ایک قصیدے کو اس طرح شروع کرتے ہیں۔

ہاں مہِ نو سنیں ہم اس کا نام
جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

یعنی شاعر شروع مہینے کے چاند سے یہ پوچھ رہا ہے کہ تو کس کو سلام کرنے کے لیے جھکا ہوا رہتا ہے اور چاند جواب میں بہادر شاہ ظفر کا نام لیتا ہے جس کے بعد مدح کا حصّہ شروع ہوتا ہے۔

۴-۲-۴ مرثیہ :

جس طرح قصیدہ کسی اہم زندہ یا زندہ جاوید شخصیت کی تعریف میں لکھا جاتا ہے اسی طرح مرثیہ کسی ایسی برگزیدہ شخصیت کے ماتم میں لکھا جاتا ہے جو وفات پا چکی ہو۔ مرثیے میں مرنے والے کے انتقال پر دُکھ درد کا اظہار بھی کیا جاتا ہے اور اس کی اچھائیاں بیان کر کے دوسروں کے لیے ان کی تقلید کرنے اور ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کا اشارہ بھی کیا جاتا ہے۔

مرثیہ بھی عربی لفظ ہے اور رِثا (یعنی آہ و زاری یا ماتم) کے لفظ سے نکلا ہے۔ اردو میں مرثیے دو قسم کے لکھے گئے ہیں :

ایک تو وہ مرثیے جو کسی بھی ایسی شخصیت کی تعریف میں اور ماتم میں لکھے گئے، جن کا انتقال ہوا ہو۔ مثلاً الطاف حسین حالی کا مرزا غالب کی وفات پر لکھا ہوا مرثیہ یا برج نرائن چکبست کا لوک مانیہ بال گنگادھر تلک کی وفات پر لکھا ہوا مرثیہ۔

دوسرے وہ مرثیے ہیں جو واقعۂ کربلا کے متعلق لکھے گئے اور اس جنگ میں شہید ہونے والے مختلف کرداروں کے بارے میں ہیں اور واقعۂ کربلا کو مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں۔ اس قسم کے مرثیوں کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے اور ان کی ادبی خوبیاں اور شاعرانہ خصوصیات بھی بہت نمایاں ہیں۔ اس قسم کے مرثیے لکھنے والوں میں سب سے اہم نام میر انیس اور مرزا دبیر کے ہیں۔

قصیدے کی طرح اس دوسری قسم کے مرثیے کے بھی مختلف حصے یا اجزائے ترکیبی ہیں۔ شروع کے حصے کو چہرہ کہتے ہیں جس میں موسم کا ذکر یا شاعری کے محاسن یا اخلاقی مضامین یا زندگی کے مختلف تجربات بیان کرتے ہیں پھر انہیں گریز کے ذریعے واقعۂ کربلا کے کسی نہ کسی پہلو سے جوڑ دیتے ہیں۔ پھر میدانِ جنگ میں آنے کے لیے خاندان سے رخصت کا سماں پیش کیا جاتا ہے پھر میدانِ جنگ میں آمد، اس کے بعد رجز یعنی لڑائی کے میدان میں آنے والا جنگ جو اپنے خاندان کے اور اپنے کارنامے بیان کرتا ہے۔ اس کے بعد جنگ کا منظر، تلوار اور گھوڑے کی تعریف اور پھر شہادت کا بیان ہوتا ہے اور رہین یعنی ماتم اور اس کے بعد دعا پر مرثیہ ختم ہوتا ہے۔

مرثیے میں قصیدے کی طرح مضمون آفرینی یعنی بات میں بات پیدا کرنے کے بجائے روانی اور جذبات نگاری پر زیادہ زور دیا جاتا ہے کیوں کہ یہاں واقعے کا بیان بھی ہوتا ہے اور اس واقعے میں شریک ہونے والے مختلف کرداروں کے جذبات کا بھی بیان کیا جاتا ہے۔ ان کرداروں کے مکالمے، ان کا ایک دوسرے سے برتاؤ اور ان کے دل پر گزرنے والی کیفیتوں کے ذکر ہی سے مرثیے میں خوبی اور اثر پیدا ہوتے ہیں۔

مرثیے کا ذکر ختم کرنے سے پہلے کربلا کے واقعے کا بھی مختصر سا ذکر ضروری ہے۔ ہوا یوں کہ اب سے کوئی تیرہ سو سال پہلے ملکِ شام کے تخت و تاج پر ایک آوارہ مزاج اور بدچلن بادشاہ یزید نے قبضہ کر لیا تھا۔ اُس نے سب کو اپنی بادشاہت اور قیادت تسلیم کرنے پر مجبور کیا۔ اُس زمانے میں مذہبی پیشوا ہی کو بادشاہ تسلیم کیا

جاسکتا تھا۔ حضرت امام حسینؑ، پیغمبرِ اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے لاڈلے نواسے تھے۔ اُنھوں نے یزید کی اطاعت تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ آخر کار یہ طے ہوا کہ وہ یزید کی حکومت سے باہر چلے جائیں۔ وہ اپنے بہتّر ساتھیوں اور خاندان والوں سمیت ساتھ سفر کر کے کربلا کے میدان تک ہی پہنچے تھے کہ یزیدی فوجوں نے اُنھیں گھیر لیا۔ ان پر تین دن تک پانی بند رکھا اور اُنھیں نہر سے پانی نہیں لینے دیا اور تیسرے دن اُنھیں شہید کر دیا اور حضرت امام حسینؑ کی بیوی شہر بانو، امام کی بہن زینب اور حضرت امام حسینؑ کی بیٹی سکینہ اور ان کے بیمار بیٹے زین العابدین کو قید کر کے شام لے گئے۔

اس واقعے کے اہم کردار حضرت امام حسینؑ، ان کے دو بیٹے علی اکبرؑ اور علی اصغرؑ (عمر چھ ماہ) ان کے چچازاد بھائی عبّاس اور بھتیجے قاسم ہیں (جن کی شادی شہادت سے دو ایک دن قبل ہی ہوئی تھی) یزید کی فوج کا ایک کمانڈر حُر حضرت امام حسینؑ سے آملا تھا وہ بھی شہید ہوا۔

یزید کی طرف سے لڑنے والوں میں ابنِ زیاد اور شمر کا نام آتا ہے جنھوں نے طرح طرح کے ظلم کیے اور شمر نے حضرت امام حسینؑ کا سر تن سے جُدا کیا۔ مرثیہ اسی واقعے کے مختلف حصّوں کو بیان کرتا ہے۔

اس قسم کے مرثیے یوں تو مختلف شکلوں میں لکھے گئے ہیں لیکن سب سے زیادہ مقبول شکل مسدّس کی رہی ہے۔ مسدّس چھ مصرعوں کے بند کا ہوتا ہے اور ہر بند کا مضمون ایک ہی ہوتا ہے اور مرثیے میں اس قسم کے بند کتنے ہوں، اُن کی تعداد پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ مسدّس کے بند کا نمونہ یہ ہے جو میر انیس کے مرثیے سے لیا گیا ہے:

نکلا وہ شیر خیمے سے باندھے علم لیے
مجرے کو آئی فتح سیاہ حشم لیے
جرأت نے بڑھ کے بوسۂ تیغِ دودم لیے
نصرت نے چُومے ہاتھ ظفر نے قدم لیے
خورشید کا جلال نگاہوں سے گر گیا
اقبال سر کے گرد ہُما بن کے پھر گیا

آپ نے دیکھا کہ اس بند میں چھ مصرعے ہیں اور چار مصرعے ایک ہی ردیف قافیے میں ہیں اور آخر کے دو مصرعے الگ ردیف قافیے کے ہیں۔ یہ سب مصرعے مل کر بند کہلاتے ہیں۔

۴-۲-۵ مثنوی

آپ نے دیکھا غزل کے ہر شعر کا مضمون الگ الگ ہوتا ہے۔ لیکن نظم، قصیدہ اور مرثیے میں ایک ہی مضمون، خیال یا کیفیت کو پیش کیا جاتا ہے ان میں مرثیے کی قسم ایسی ہے جو صرف ایک ہی واقعے کے مختلف حصوں کو بیان کرتی ہے۔ اس میں ہر قسم کے واقعات کو بیان کرنے کی آزادی نہیں ہے۔ مثنوی میں یہ آزادی ہے کہ آپ کسی قسم کے واقعے کو بیان کر سکتے ہیں۔

مثنوی عام طور پر کسی نہ کسی واقعے کا ہی بیان ہوتی ہے اور یہ واقعہ یا تو عشقیہ ہوتا ہے یا صوفیانہ نہ کہ خیالی یا اخلاقی نصیحت کا قصہ۔ کبھی کبھی مثنوی کسی ایک چیز یا کیفیت پر بھی لکھی جاتی ہے۔ جیسے گرمی یا سردی کے موسم پر یا پھر حقے، تمباکو یا قہوے پر۔

مثنوی کے مصرعے چھوٹے ہوتے ہیں۔ یہ چھوٹی بحروں ہی میں لکھی جاتی ہے۔ اور اس کا ہر مصرع اور دوسرے مصرعے میں ایک ہی ردیف اور ہم آواز قافیے موجود ہوتے ہیں۔ پوری مثنوی گو ایک بحر میں ہوتی ہے۔ مگر پوری مثنوی میں ایک ردیف یا ایک ہی قسم کے قافیے نہیں ہوتے۔

مثنوی کی خوبی بھی واقعے کے بیان جذبات نگاری اور روانی سے جانچی اور پرکھی جاتی ہے۔ اردو میں یوں تو مثنویاں بہت سی لکھی گئی ہیں، مگر سب سے زیادہ مشہور مثنویاں تین ہیں اور تینوں میں عشقیہ قصے ہی بیان کیے گئے ہیں۔ یہ تین مثنویاں ہیں: میر حسن کی مثنوی 'سحر البیان'، دیا شنکر نسیم کی مثنوی 'گلزار نسیم' اور نواب مرزا شوق کی مثنوی 'زہر عشق'۔

مثنوی کا نمونہ یہ ہے:

شتابی مجھے ساقیا دے شراب — کہ یہ حال سن کر ہوا دل کباب
یہاں کا تو قصہ میں چھوڑا یہاں — ذرا اب سنو غم زدوں کا بیاں
کروں حال ہجراں زدوں کا رقم — کہ گزرا جدائی سے کیا ان پہ غم
کھلی آنکھ جو ایک کی واں کہیں — تو دیکھا کہ وہ شاہزادہ نہیں
نہ ہے وہ پلنگ اور نہ وہ ماہ رو — نہ وہ گل ہے اس جا نہ وہ اس کی بو
رہے دیکھ یہ حال حیران کار — کہ "یہ کیا ہوا ہائے پروردگار"

(مثنوی سحر البیان سے)

۴-۲-۶ دیگر اصناف : رُباعی، قطعہ :

آئیے، پھر ایک بار ۴-۲ کو پڑھیں۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ شاعری کی دو قسمیں دو طریقوں سے کی گئی ہیں۔ ایک ان باتوں کے لحاظ سے جو ان میں بیان کی جائیں اور دوسری ساخت کے لحاظ سے

آپ نے دیکھا کہ :

ا۔ غزل کی باتیں یا نفسِ مضمون، قصیدے، مرثیے اور مثنوی سے الگ ہوتا ہے اور اس کی ساخت بھی الگ ہے۔ اس کا لہجہ اور لفظیات بھی الگ ہیں۔

ب۔ قصیدہ نفسِ مضمون کے اعتبار سے بھی الگ اور ساخت کے اعتبار سے بھی سب سے جُدا گانہ ہے۔

ج۔ مثنوی کا بھی یہی حال ہے۔ نفسِ مضمون بھی الگ ہے اور ساخت بھی الگ۔

د۔ مرثیے کا بھی یہی حال ہے گو مرثیے کی ساخت ہمیشہ ایک سی نہیں رہی ہے۔ مرثیے چھ مصرعوں کے بند میں بھی لکھے گئے ہیں۔ اور دوسری شکلوں میں بھی۔

آئیے، اب ایسی اصناف پر غور کریں جو صرف اپنی ساخت مختلف ہونے کی وجہ سے پہچانی جاتی ہیں۔ ان میں خاص طور پر اہم ہے ـــــ رُباعی۔

رباعی عربی لفظ ہے۔ 'ربع' کے معنی ہیں چار۔ رباعی اس شاعری کو کہنے لگے جو چار مصرعوں میں ایک بات کو پوری طرح ادا کرے۔ ان چار مصرعوں کے لیے دو باتیں اور بھی لازمی ٹھہریں۔

ایک یہ کہ ان چار مصرعوں میں پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرعے کی ایک ہی ردیف ہو اور ہم قافیہ ہوں۔ اور

دوسرے یہ کہ یہ چاروں مصرعے ان بحروں میں ہوں جو رباعی کے لیے مخصوص ہیں۔ اس بحر کی عام پہچان لاحول ولاقوۃ الا باللہ سے کی جاتی رہی ہے۔

اگر کوئی ایسے چار مصرعے ہوں جن میں بات پوری کہی گئی ہو اور پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرع ہم ردیف اور ہم قافیہ بھی ہو لیکن بحر رباعی کی نہ ہو تو اس کو رباعی نہیں کہیں گے، قطعہ کہیں گے۔

قطعے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ کسی ایک بحر میں ہو یا خاص بحروں میں سے کسی ایک میں ہو۔

یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ اس کے چار ہی مصرعے ہوں۔ اور پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم ردیف اور ہم قافیہ ہوں۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ کم سے کم چار مصرعے ہوں اور ایک ہی مضمون بیان کیا جائے۔

قطعہ الگ بھی ہو سکتا ہے۔ قطعہ غزل کے بیچ میں بھی آ سکتا ہے اور ایسے اشعار کو بیچ میں 'ق' کا لفظ لکھ کر ظاہر کیا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر:

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا ناگہہ وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ "دیکھ کے چل راہ بے خبر ق میں بھی کبھو کسو (ہڈی) کا سر پہ غرور (ٹوٹ پھوٹ) تھا"

یہ قطعہ ہے رباعی نہیں ہے۔

رباعی لکھنے والوں میں سب سے اہم نام تو عمر خیام کا ہے۔ مگر اس کی رباعیاں فارسی میں لکھی گئی ہیں۔ اردو شاعروں میں سب سے اہم نام یہ ہیں:

میر انیسؔ
الطاف حسین حالیؔ
جوشؔ ملیح آبادی
فراقؔ گورکھپوری اور
امجدؔ حیدر آبادی

رباعی کی دو مثالیں یہ ہیں:

دنیا بھی عجب سرائے فانی دیکھی ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
جو آ کے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا جو جا کے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

(انیسؔ)

دل رسم کے سانچے میں نہ ڈھالا ہم نے اسلوبِ سخن نیا نکالا ہم نے
کے لیے خورشید پہ بڑھ کے ہاتھ ڈالا ہم نے

(جوشؔ ملیح آبادی)

مشق II

۱۔ جس صنفِ شعر میں کسی زندہ یا زندہ جاوید شخصیت کی تعریف کی جائے اسے کیا کہتے ہیں؟ الف: مرثیہ

ب : قصیدہ

ج : مثنوی

۲۔ جس صنف میں کسی کی موت پر رنج اور افسوس کا اظہار کیا جائے اور مرنے والے کی خوبیاں بیان کی جائیں اس صنف کو کیا کہتے ہیں؟

الف : رباعی

ب : قصیدہ

ج : مرثیہ

۳۔ شعر کے آخر میں جوں کا توں آنے والے لفظ یا حرف کو کیا کہتے ہیں؟

الف : ردیف

ب : قافیہ

ج : بحر

۴۔ داخلی لہجے اور علامتی انداز میں کسی واقعے یا تجربے یا کیفیت کے نتیجے کو بیان کرنے والی صنف کا نام بتائیے :

الف : نظم ج : مثنوی

ب : مرثیہ د : غزل

۵۔ کسی واقعے یا کسی ایک منظر کو تسلسل کے ساتھ مختلف ردیف اور قافیوں کے اشعار میں بیان کرنے والی صنف کا نام بتائیے؟ الف : غزل

ب : قطعہ

ج : مثنوی

د : نظم

۶۔ قصیدے کے پانچ اجزائے ترکیبی بیان کیجیے :

(جوابات آخر میں دیے گئے ہیں)

اپنا امتحان خود لیجیے II

۱۔ غزل کے پہلے شعر کو جس میں ردیف اور قافیہ دونوں موجود ہوں کیا کہتے ہیں؟

الف : مقطع

ب : مطلع

ج : قطعہ

۲۔ نظم کے لیے کون سی دو چیزیں ہیں جو سب سے زیادہ ضروری ہیں؟

الف : ردیف اور قافیہ

ب : تشبیہ اور استعارہ

ج : تسلسل اور ارتقا

۳۔ قصیدے کے اجزائے ترکیبی بیان کیجیے:

۴۔ مرثیے کے اجزائے ترکیبی بیان کیجیے:

۵۔ اردو کی تین اہم ترین مثنویوں کے نام بتائیے؟

الف : آہنگ، شعلہ و شبنم، نقشِ فریادی

ب : سحرالبیان، گلزارِ نسیم، زہرِ عشق

ج : غبارِ خاطر، بالِ جبریل، آتشِ گل

۶۔ قطعے اور رُباعی میں کیا فرق ہے؟

الف : رباعی خاص اوزان میں ہوتی ہے اور چار مصرعے ہونا ضروری ہیں۔

ب : قطعہ خاص اوزان میں نہیں ہوتا اور چار مصرعوں سے زیادہ کا بھی ہو سکتا ہے۔

(جوابات آخر میں دیے گئے ہیں)

۴-۳ نثر کی اصناف

اب تک کی بات چیت شاعری کی مختلف اصناف کے بارے میں تھی۔ آپ نے دیکھا کہ ان کو یا تو نفسِ مضمون کے لحاظ سے مختلف قسموں میں بانٹا گیا یا پھر ساخت کے لحاظ سے ان کی پہچان کی گئی ہے اسی طرح نثر میں لکھی جانے والی اصناف کا حال ہے۔

نثر یوں تو ہم دن رات بولنے چالنے میں استعمال کرتے ہیں، لیکن جب ہم اسے لکھنے لگتے ہیں تو اس کی قسمیں بھی اسی طرح ہو جاتی ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب ہم نثر کا استعمال کرتے ہیں تو عام طور پر تین طریقوں میں سے ایک طریقہ ضرور برتتے ہیں۔

الف۔ یا تو کسی کہانی یا قصّے کو بیان کرتے ہیں۔

(جیسے ناول، قصّہ، داستان اور افسانے میں)

یا ب۔ اپنے دل کی بات کو جوں کا توں بیان کر دیتے ہیں اور کسی مثال یا قصّے کا

سہارا نہیں لیتے (جیسے انشائیہ مضامین میں)

یا ج ۔ پھر نثر کو کسی دوسرے مضمون یا کاروبار کی باتیں بیان کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں (جیسے دفتری معاملات میں یا سائنس، جغرافیہ اور اقتصادیات کے مسئلے بیان کرنے میں)

ہم یہاں پہلی اور دوسری قسم کی نثری اصناف کا ذکر کریں گے۔ تیسرے کا ذکر آپ کے چوتھے بلاک کی اکائیوں میں آئے گا۔

۴-۳-۱ ناول، داستان اور قصّہ

آپ نے غزل اور نظم کے بارے میں پڑھا۔ غزل میں شاعر واقعے کو بیان نہیں کرتا۔ واقعے سے حاصل ہونے والے تجربے کی کیفیت کو ذاتی تاثر کے طور پر بیان کرتا ہے۔

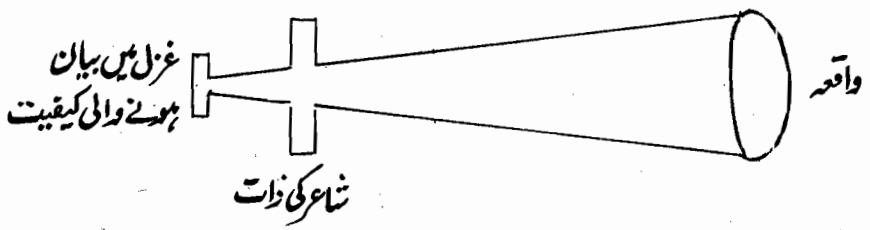

شکل (الف)

گویا واقعہ پہلے شاعر کی ذات کی بھٹی میں تپ کر کیفیت کی شکل اختیار کرتا ہے اور اس کیفیت کا خلاصہ ذاتی یا داخلی تاثرین کر غزل میں ادا ہوتا ہے۔

اگر آپ غور کریں تو افسانوی ادب میں ہمارے لکھنے والے اس عمل کو دہری سطح پر برتتے ہیں۔ پہلے تو یہی صورت ہوتی ہے کہ افسانہ نگار، ناول نگار یا قصہ گو اور داستان گو زندگی کے مختلف واقعات کی مدد سے ذاتی تاثر، نتیجے یا کیفیت تک پہنچتا ہے۔

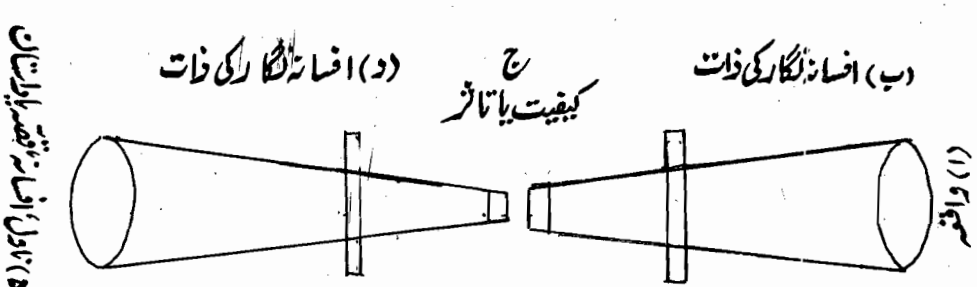

شکل (ب)

گویا ناول نگار یا افسانہ نگار پہلے زندگی کے واقعات سے ذاتی تاثر یا کیفیت حاصل کرتا

ہے اور خود کسی نتیجے پر پہنچتا ہے پھر اس نتیجے یا تاثر کو ایک بار پھر اپنی ذات سے گزار کر اسے کسی ایسے مربوط واقعے کی شکل دیتا ہے جس کی مدد سے اس کے پڑھنے والے پر وہی تاثر اور کیفیت طاری ہو سکے جو خود لکھنے والے پر طاری ہوئی تھی یا جسے وہ اپنے پڑھنے والوں پر طاری کرنا چاہتا ہے اسی لیے افسانوی ادب کو بازیافت اور ترتیبِ نَو کا عمل کہا گیا ہے ۔

قصّہ گو کا مقصد محض کہانی کہنا نہیں ہوتا بلکہ اس کہانی کے ذریعے کسی نہ کسی مرکزی خیال، تاثر یا کیفیت کو پیش کرنا اس کا مقصد ہوتا ہے اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے وہ واقعات گڑھتا ہے یا پیش آنے والے واقعات میں ترمیم و ترتیب کرتا ہے تاکہ وہ ایک سانچے میں ڈھل جائیں اور ان میں کسی قسم کی بے ترتیبی نہ رہے —— اس قسم کے ادب کو ہم افسانوی ادب کہتے ہیں ۔

افسانوی ادب کو آسانی کے لیے پانچ حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اور یہی اس کی اصناف ہیں :

الف ۔ قصّہ

ب ۔ داستان

ج ۔ مختصر ناول یا ناولٹ

د ۔ مختصر افسانہ

ہ ۔ ڈراما

اس میں پہلی چار کا ذکر اس اکائی میں کیا جائے گا۔ ڈرامے کا ذکر بلاک ۳ کی اکائی ۲ میں آئے گا۔

ان سبھی اصناف میں مرکزی خیال تاثر یا کیفیت کو ادا کرنے کے لیے کسی نہ کسی واقعے یا واقعات کے سلسلے کا سہارا لیا جاتا ہے لہٰذا واقعہ ان سب کا لازمی عنصر ہے اور واقعے چونکہ جاندار وں کو پیش آتے ہیں جو اپنے طرزِ عمل، باہمی ٹکراؤ یا باہمی تعاون کے ذریعے واقعات پر اثر ڈالتے ہیں ۔ اس لیے تیسرا اہم عنصر کردار نگاری کا ہونا لازمی ہے اور یہ کردار چونکہ صرف کام ہی نہیں کرتے ۔ بولتے چالتے بھی ہیں لہٰذا ان کے لیے مکالمے ضروری ہیں اور چوتھا عنصر مکالمہ نگاری کا لازمی ہو جاتا ہے ۔ آخر میں چونکہ ان واقعات اور کرداروں کے ذریعے مصنف کا تصورِ حیات اور طرزِ بیان ظاہر ہوتا ہے ۔ اس لیے ان دونوں عناصر کو بھی افسانوی ادب کی سبھی اصناف کے اجزائے ترکیبی میں شامل کیا جاتا ہے ۔

آپ کہیں گے کہ اگر ہر قسم کے افسانوی ادب کے لیے یہی سارے عناصر ضروری ہیں تو پھر بھلا افسانوی ادب کی مختلف قسموں یا اصناف میں فرق ہی کیا ہوا؟ جی نہیں۔ فرق ہے اور ضروری ہے۔

پہلے داستان، قصہ اور ناول کے فرق کو دیکھیے۔ قصہ تو اپنا سیدھا سادا چھوٹا سا ایک ہی وقفہ میں پڑھے جانے والا واقعہ ہوتا ہے جس میں عام طور پر پیچیدگی نہیں ہوتی یعنی اس کے اندر سے کوئی دوسرا قصہ برآمد نہیں ہوتا۔ یہ قصہ کوئی واقعہ بھی ہو سکتا ہے اور تمثیل بھی۔ عام زندگی سے بھی متعلق ہو سکتا ہے اور جن پریوں، دیو اور جن، بھوتوں سے بھی متعلق ہو سکتا ہے۔

لیکن داستان کئی قصوں سے مل کر بنتی ہے، طویل ہوتی ہے۔ عام طور پر جن، پریوں، جادوگر، عیار اور نیک و بد طاقتوں کے ٹکراؤ کو بیان کرتی ہے اور ایک قصے سے دوسرا قصہ پیدا ہوتا ہے۔ کردار بھی یا تو پوری طرح نیک، خوب صورت، بہادر اور ایمان دار ہوتے ہیں۔ یا پھر بالکل ہی بُرے، خوف ناک اور دھوکے باز ہوتے ہیں۔ پھر داستان میں فوق فطری عناصر اور کردار ہوتے ہیں۔ اندازِ بیان سادہ نہیں ہوتا بلکہ سجا بنا ہوا ہوتا ہے۔

اس کے مقابلے میں **ناول** طویل تو ضرور ہوتا ہے اور مختلف قصوں سے مل کر بھی بنتا ہے، مگر فوق فطری عناصر اور کرداروں سے خالی ہوتا ہے۔ اس میں جن، پری، دیو یا عیاروں کی کارگزاریاں نہیں ہوتیں بلکہ عام انسانی زندگی کے واقعات کسی خاص فکری زاویے سے بیان کیے جاتے ہیں تاکہ ناول نگار کا تصورِ حیات اور ناول کا مرکزی خیال سامنے آجائے۔ کردار بھی عام زندگی سے تعلق رکھنے والے انسانوں ہی کی طرح خوبیوں اور کمزوریوں کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ یعنی اچھے بھی اور بُرے بھی اور ناول میں بیان ہونے والے واقعات انہیں تبدیل بھی کرتے ہیں کبھی ان کی کمزوریوں کو اُبھار دیتے ہیں۔ کبھی بد کو نیک بنا دیتے ہیں۔

اس طرح داستان اور ناول کا بنیادی فرق کہانی کی ساخت اور واقعات اور کرداروں کی نوعیت ہی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے یعنی

الف۔ داستان میں قصے کے اندر سے قصہ پیدا ہوتا ہے، مگر ناول میں مختلف قصے آکر کسی ایک بنیادی کڑی میں آکر مل جاتے ہیں اور

ب۔ واقعات، داستان میں فوق فطری ہوتے ہیں اور ناول میں عام زندگی

سے متعلق۔

جہاں تک کردار نگاری کا تعلق ہے:

الف۔ داستان کے کردار اکثر فوق فطری ہوتے ہیں:
یا تو ساری خوبیوں کا مجموعہ ہوتے ہیں یا سبھی خرابیوں کا مجموعہ۔
عام طور پر نیک آخر تک نیک رہتا ہے اور بد آخر تک بد رہتا ہے اور
کرداروں کے مزاج اور نوعیت میں عام طور پر تبدیلی نہیں ہوتی۔

ب۔ ناول کے کردار فوق فطری نہیں ہوتے۔ ان میں نیک اور بد دونوں عناصر
ملتے ہیں اور ان کے مزاج اور نوعیت میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اندازِ بیان
کے اعتبار سے داستان کا اسلوب سجا ہوا ہوتا ہے اور ناول کا
اسلوب رواں اور عام بول چال کی زبان سے قریب ہوتا ہے۔

اُردو کی داستانوں میں سب سے زیادہ مشہور داستان ہے، داستانِ امیر حمزہ یا طلسم ہوش رُبا اور ناولوں میں سب سے اہم ناول ہیں ــــ رتن ناتھ سرشار کا فسانۂ آزاد، مرزا محمد ہادی رُسوا کا اُمراؤ جان ادا اور پریم چند کا ناول گئودان۔

۴-۳-۲ مختصر افسانہ اور ڈراما

اُردو میں ناول کا چلن دیر سے ہوا۔ قصہ پہلے سے موجود تھا اور داستانوں کا رواج بھی اچھا خاصا پرانا ہے۔ لیکن انگریزوں کے ہندوستان آنے کے بعد انگریزی زبان و ادب سے واقفیت کے ذریعے ہم ناول تک پہنچے۔

اُنیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں پریم چند اور سجاد یلدرم نے اردو میں مختصر افسانے لکھنے شروع کیے۔ ناول کا قصہ تو لمبا ہوتا ہے اور اس قصے کے ساتھ کئی اور قصے بھی جُڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ مختصر افسانے میں صرف ایک ہی قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ ناول میں تو پوری تہذیب کا پس منظر موجود رہتا ہے۔ مختصر افسانے میں اس پس منظر کو بہت کم کر دیا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ناول تہذیب کی آپ بیتی ہے اور مختصر افسانہ فرد کی۔ ان دونوں میں اگر کوئی فرق ہے تو بڑے اور چھوٹے پیمانے کا فرق ہے مگر اس فرق کی وجہ سے مختصر افسانے میں تاثر سمٹ کر اور گہرا اور بھرپور ہو جاتا ہے جب کہ ناول میں یہ تاثر زیادہ پھیلا ہوا ہوتا ہے اور زیادہ بلند اور تہہ دار ہو جاتا ہے۔

ڈرامے کا تعلق بھی افسانوی ادب سے ہے کیوں کہ ڈرامے میں بھی کوئی نہ کوئی قصّہ ہی بیان کیا جاتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ ناول اور افسانے کے مقابلے میں ڈراما بیانیہ حصّوں سے نہیں، صرف مکالمے کے ذریعے بات کہتا ہے۔ ڈراما نگار ڈرامے میں بولتا ہے تو صرف اپنے کرداروں کی زبان سے۔ وہ براہِ راست کسی واقعے یا کردار کو بیان نہیں کرتا۔

مختصر افسانے اور ڈرامے کے بارے میں تفصیل کے ساتھ آپ کے تیسرے بلاک میں ذکر کیا جائے گا۔ اس لیے یہاں ان پر مزید گفتگو ضروری نہیں ہے۔

۴-۳-۳ انشائیہ

ایک بار پھر پیچھے کی طرف لوٹیے۔ ذرا ۳-۴ نکالیے جس میں نثر کے مختلف استعمال بتائے گئے ہیں۔ وہاں (ب) میں نثر کے بے تکلف استعمال کا ذکر کیا گیا ہے کہ اپنے دل کی بات جوں کی توں بیان کر دی جائے اور اسے کسی واقعے یا کردار کی شکل نہ دی جائے۔ انشائیہ کا دائرۂ عمل یہی ہے

آپ کے ہاتھ میں چائے کی پیالی ہے، دھوپ کھلی ہوئی ہے۔ آپ سبزہ زار پر بیٹھے ہیں یا اپنی کھڑکی سے باہر کھلے نیلے آسمان پر اُڑتی ہوئی ابابیل سے لُطف لے رہے ہیں۔ کمرے میں ریڈیو بج رہا ہے یا گلی میں لڑکے شور کر رہے ہیں۔ اگر آپ کے دل پر ان میں سے کسی ایک واقعے نے کوئی اثر چھوڑا ہے تو آپ اسے انشائیہ کا موضوع بنا سکتے ہیں۔ صبح کی چہل قدمی، دوپہر کی لذّت، رات کی نیند، دوستوں کا لُطفِ صحبت، گپ شپ کا مزا، گھریلو نوک جھونک۔ غرض زندگی کے کھٹے میٹھے ہر قسم کے لمحے انشائیے کے لیے ہر قسم کا مواد فراہم کر سکتے ہیں۔ پہچان انشائیے کی ذاتی اور نجی کیفیت ہے جو بناوٹ اور صناعی کی روادار نہیں ہوتی پھر اس کا ہلکا پھلکا انداز ہے جو اسے من کی موج بنا دیتا ہے۔

اگر دوٹوک لفظوں میں کہنا ہو تو یوں کہیں گے کہ انشائیہ افسانوی ادب کی اصناف سے اس اعتبار سے مختلف ہے کہ اس میں عام طور پر قصّہ ہوتا ہے نہ کردار۔ اس کا لہجہ بیانیہ کی بجائے ذاتی اور نجی ہوتا ہے اور اس میں گہری سنجیدگی اور متانت کے بجائے ہلکا پھلکا پن اور ایک لطیف مزاح کا پہلو پایا جاتا ہے۔

انشائیہ پر بھی آپ سے تفصیلی گفتگو تیسرے بلاک ہی میں کی جائے گی۔

یہاں اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ جس طرح شاعری میں غزل نجی لب و لہجے کی صنف ہے اسی طرح نثر میں انشائیہ بھی نجی لب و لہجے کی صنف ہے، گویا نثر کی غزل ہے۔ گو غزل کی طرح مختصر اور علامتی نہیں ہے مگر کیفیاتی ضرور ہے۔

۴-۳-۴ دیگر اصناف

نثر کی دیگر اصناف میں طنز و مزاح اور رپورتاژ کا ذکر بھی کرتے چلیں۔ طنز و مزاح کا ذکر یوں تو انشائیہ میں آگیا ہے اور یہ صحیح بھی ہے کہ انشائیہ میں طنز و مزاح کی چاشنی ہوتی ہے مگر طنز و مزاح والے مضامین کا انشائیہ ہونا ضروری نہیں ہوتا، لیکن ٹھہریئے، پہلے ذرا طنز و مزاح کے فرق پر گفتگو کر لی جائے۔

آپ جانتے ہیں ہنسنا اور رونا کسے نہیں آتا۔ یہاں تک کہا گیا ہے کہ انسان ہنسنے والا جانور ہے۔ سارے جانداروں میں ہنسنے پر صرف انسان ہی کو قدرت حاصل ہے۔ ہم ہنستے عام طور پر اس وقت ہیں جب معمول کے خلاف کوئی ایسا واقعہ دیکھتے ہیں، جس کے اثرات خود ہم پر یا ہمارے متعلقین پر نہ پڑ رہے ہوں۔ مثلاً کوئی موٹا آدمی کیلے کے چھلکے پر سے پھسل کر گر پڑے تو ہم ضرور ہنسیں گے۔ بشرطیکہ گرنے والا ہمارا اپنا کوئی عزیز نہ ہو۔ ہم اس لیے ہنسیں گے کہ گرنا غیر معمولی یا خلافِ معمول حرکت ہے۔

طنز بھی ہم عام طور پر اسی وقت کام میں لاتے ہیں جب ہم کسی دوسرے کا مذاق اڑا کر اس کے غیر معمولی اور خلافِ معمول ہونے کا احساس دلانا چاہتے ہیں۔ لیکن طنز میں کسی پر چوٹ کرنا یا کسی کا مذاق اڑانا ضروری ہے۔ اسی لیے طنز میں مزاح کا پہلو ہونا لازمی ہے تاکہ جس پر ہنسا جا رہا ہے، وہ بھی لطف اندوز ہو سکے اور دوسروں کو بھی مزا تو آئے مگر جس پر طنز کی جا رہی ہے، اس سے ہمدردی نہ ہو جائے۔

طنز کے لیے مزاح کا ہونا لازمی ہے، مگر مزاح کے لیے طنز لازمی نہیں۔ کیوں کہ ہم کسی دوسری چیز یا کسی دوسرے شخص پر چوٹ کیے بغیر بھی ہنس سکتے ہیں۔

طنز و مزاح کے مضامین انشائیہ بھی ہو سکتے ہیں مگر لازمی طور پر ان کا انشائیہ ہونا ضروری نہیں ہے کیوں کہ اس قسم کے مضامین، نجی لب و لہجے کے بغیر بھی لکھے جا سکتے ہیں یا لکھے گئے ہیں۔ جیسے پطرس بخاری کا مضمون "لاہور کا جغرافیہ"۔

اردو کے طنز و مزاح نگاروں میں پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی، کنہیا لال کپور

اور مشتاق احمد یوسفی کے نام سرِ فہرست ہیں۔

رپورتاژ نثر کی ایک اور صنف ہے جو حال ہی میں وجود میں آئی ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کسی نہ کسی واقعے کا بیان ذاتی لب و لہجے کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ گویا یہ محض کسی واقعے کا خارجی بیان نہیں رہتا بلکہ اس میں ذاتی لب و لہجہ یا نجی رنگ پیدا کر کے یہ انشائیے کا انداز اختیار کر لیتا ہے۔ رپورتاژ کسی بھی واقعے پر لکھے جا سکتے ہیں۔ ریل کا سفر، کسی جلسے کی روداد یا آپ بیتی کا کوئی ایسا ٹکڑا جو نجی بھی ہو اور عام دل چسپی کا بھی ہو۔ اردو میں رپورتاژ کی اچھی مثالیں کرشن چندر کے ہاں ملتی ہیں۔

آخر میں سوانح حیات کا بھی تذکرہ ضروری ہے۔ ظاہر ہے اس کا مقصد افسانوی ادب سے بھی مختلف ہوتا ہے اور انشائیہ سے بھی الگ ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد محض فرضی یا اختراعی واقعات یا محض تخیل پر نہیں ہوتی بلکہ خود اپنی زندگی یا کسی دوسرے کی زندگی کے اہم واقعات اس کی بنیاد بنتے ہیں۔

مکتوب نگاری یا خطوط نگاری بھی اس سلسلے کی ایک اور صنف ہے جس کو گو شعوری طور پر اختیار کرنا لازم نہیں، مگر بعض شخصیتیں اس قدر گوناگوں اور دل کش ہوتی ہیں کہ ان کے خطوط میں ان کی اپنی زندگی کا عکس اور لہجے کا کھلا ڈلا پن خاص دل کشی پیدا کر دیتا ہے۔ ان کی ذات کا جادو ہی ان خطوط کو پُر اثر بناتا ہے، جس کی مثالیں غالب، چودھری محمد علی، ابوالکلام آزاد اور رشید احمد صدیقی کے خطوط میں ملتی ہیں۔

مشق III

اپنا امتحان خود لیجیے۔۔۔۔ III

۴۔۴ خلاصۂ بحث

اب آپ اس مرحلے تک پہنچ گئے ہیں جب نظم اور نثر کی مختلف اصناف کی پہچان کر سکیں۔ آپ نے یہ بھی اندازہ کیا ہوگا کہ ان سبھی اصناف میں بہت سی چیزیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں اور اس کے باوجود ایک دوسرے سے الگ کر کے پہچانی بھی جا سکتی ہیں۔ بنیادی فرق ایک یہ ہے کہ ان میں انسانی زندگی کے بعض تجربات کو یا ان سے حاصل کردہ نتیجوں اور کیفیتوں کو جوں کا توں اپنے نجی لب و لہجے کے ساتھ بیان کر دیتی ہیں۔ جیسے شاعری میں غزل اور انشائیے اور بعض اس نتیجے اور کیفیت کو واقعہ اور کردار کی شکل میں ڈھال کر نئی ترتیب کے ساتھ پیش کرتی ہیں اور اسے نیا وجود عطا کرتی ہیں۔ آپ اب انہیں کسی قدر بھروسے کے ساتھ برت سکتے ہیں۔

مشق III

۱۔ داستان اور ناول کا فرق واضح کیجیے

	داستان میں	ناول میں
الف۔ قصّے کی ساخت		
ب۔ کرداروں کی خصوصیات		
ج۔ اندازِ بیان کے اعتبار سے		

۲۔ ناول اور مختصر افسانے کا فرق واضح کیجیے :

۳۔ کون سی صنف کس کے لیے مخصوص ہے ؟

(الف) ناول ——— (الف) واقعات کا تاثراتی اور رنجی بیان

(ب) انشائیہ ——— (ب) کسی بات یا کیفیت کا ذاتی بیان

(ج) رپورتاژ ——— (ج) کسی ایک واقعے کی مربوط تاثراتی تشکیل

(د) مختصر افسانہ ——— (د) تہذیبی فضا کی عکّاسی

اپنا امتحان خود لیجیے III

۱۔ اصنافِ ادب کی تقسیم کس لحاظ سے کی گئی ہے :

(الف) (ب)

۲۔ انگریزی ادب کے اثر سے اردو ادب میں عام ہونے والی اصناف کون سی ہیں ؟

(الف) غزل (ب) ناول (ج) مثنوی (د) رباعی

(و) مختصر افسانہ (ہ) نظم

۳۔ ایسی اصناف کون سی ہیں جو زندگی کے واقعات سے تجربہ حاصل کر کے ان کا نچوڑ ذاتی تاثّر کی شکل میں بیان کرتی ہیں :

(الف) نظم (ب) مثنوی (ج) غزل (د) داستان

(ہ) ناول (و) مختصر افسانہ (ز) انشائیہ

۴۔ ایسی اصناف کون سی ہیں جو زندگی سے حاصل شدہ تجربات یا کیفیات کو واقعات کی شکل میں پیش کرتی ہیں؟

(الف) نظم (ب) مثنوی (ج) غزل (د) داستان

(ہ) ناول (و) مختصر افسانہ

۵۔ غزل اور انشائیہ کی مشترک خصوصیات بیان کیجیے :

مزید مطالعے کے لیے :

رسالہ "ادب" علی گڑھ کا اصنافِ سخن نمبر

جوابات

مشق I

۱ - عورتوں سے یا اُن کے بارے میں باتیں کرنا۔
زخمی ہرن کی آواز۔ کپڑا بُننا۔

۲۔ عشقیہ، صوفیانہ، اخلاقی اور سیاسی

۳۔ کسی واقعے کے ذاتی اثر کا بیان

۴۔ بحر، ردیف، قافیہ، ہر شعر کا مکمل ہونا

۵۔ گل، بلبل، شمع، پروانہ، شراب، ساقی، محفل، زنجیر، زنداں، صحرا۔

۶۔ ہر شعر کے آخر میں جوں کا توں آنے والا حرف یا لفظ ردیف ہے۔
اور اس سے پہلے ہم آواز آنے والا لفظ قافیہ ہے۔

اپنا امتحان خود لیجیے : I

(۱) نکلے ردیف۔ دم۔کم قافیے

(۲) پہلا مطلع ہے دوسرا مقطع

(۳) واقعات، تجربات، کیفیات

مشق II

علامتوں، داخلی

۱۔ (ب) ۲۔ (ج) ۳۔ (الف) ۴۔ (د) ۵۔(ج)

۶۔ تشبیہ، گریز، مدح وغیرہ۔

اپنا امتحان خود لیجیے II

۱- (ب) ۲- (ج) ۳- دیکھیے پچھلی مشق کے سوال ۶ کا جواب

۴- چہرہ، گریز، آمد، رجز، رزمیہ، شہادت، بین، دُعا۔

۵- (ب) ۶- رباعی (الف) قطعہ (ب)

مشق III

۳- الف د = ب - الف = ج ج = د - ب =

اپنا امتحان خود لیجیے III

۱- نفسِ مضمون اور (ب) ساخت کے اعتبار سے

۲- ب - ہ - و ۳- ج اور الف ۴- ب - د - و - ہ

۵- دونوں ذاتی اور تاثراتی

مزید مطالعے کے لیے:

رسالہ ادیب، علی گڑھ (اصنافِ سخن نمبر)

اردو میں اصنافِ سخن ڈاکٹر شمیم احمد